For more books visit www.4Urdu.com
A-PDF Watermark DEMO: Purchase from www.A-PDF.com to remove the watermark

اس جواب پر میرے دل میں بھی یہ شبہ پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو صدر ایوب بیماری کے پردے میں کسی اور آفت کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں۔ صحیح واقعات معلوم کرنے کے لیے

URDU4U.COM

میں اسی روز وزارت اطلاعات و نشریات کے سیکرٹری الطاف گوہر کے پاس پہنچا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ہم سب کی طرح ایوان صدر کے اندرونی حالات سے وہ بھی قطعی طور پر لا علم ہیں۔

شروع میں ہر طرف طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ سب کو یہ معلوم گیا کہ جناب صدر واقعی شدید بیمار ہیں۔ ان کی بیماری کی نوعیت پر پردہ ڈالنے کی غرض سے سرکاری سطح پر انواع و اقسام کے ہتھکنڈے استعمال کئے گئے ہیں لیکن یہ سب حربے بے سود ثابت ہوئے۔ چند روز بعد جب صدر کی صحت کے بارے میں میڈیکل بلیٹن جاری ہونا شروع ہوئے تو یہ اس قدر سطحی' جھرجھرے اور بعض اوقات خود تردیدی ہوتے تھے کہ کسی کو ان کی صداقت پر یقین نہ آتا تھا۔ چاروں طرف افواہوں کی بھرمار تھی۔ اور ہر شخص اپنی پسند کی افواہ کو اپنی آرزومندی کے سانچے میں ڈھال کر مزید قیاس آرائیاں اڑانے اور پھیلانے میں مکمل طور پر آزاد تھا۔

صدر ایوب کی بیماری کے پہلے سات آٹھ روز انتہائی خطرناک اور غیر یقینی تھے۔ جب تک وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار رہے' جنرل یحیٰی خاں نے ان کا رشتہ بیرونی دنیا سے پوری طرح منقطع رکھا اور صدر کی ذات اور ایوان دونوں پر اپنا تصرف مکمل طور پر جمائے رکھا۔ اس پورے عرصہ کے دوران کسی سویلین کو ایوان صدر کے بیرونی احاطے کی دیوار تک چھونے کی اجازت نہ تھی لیکن جب ان کی حالت کسی قدر سنبھل گئی اور فوری موت کا خطرہ سر سے ٹلتا ہوا نظر آنے لگا تو یہ پابندیاں بھی کسی حد تک نرم پڑ گئیں۔ چنانچہ دسویں روز صدر ایوب کی خواہش پر محمد بشیر خالد صاحب پہلے سویلین تھے جنہیں چند منٹ کے لیے ان کے ساتھ ملاقات کی اجازت ملی۔ اس زمانے میں وہ پرسنل اسسٹنٹ کے طور پر صدر کے خصوصی معتمد تھے۔ بعد ازاں تہران میں آر سی ڈی

For more books visit www.4Urdu.com

کے ثقافتی ادارے میں ڈپٹی ڈائریکٹر رہے۔ اور آج کل وفاقی وزارت ثقافت میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہیں۔ غالباً صدر ایوب کو اس احساس نے ستانا شروع کر دیا تھا کہ بیماری شروع ہونے کے بعد سے اب تک انہیں پاکستان کی سول حکومت کے ہر فرد و بشر سے خاص طور پر جان بوجھ کر زبردستی مطلقاً الگ تھلگ رکھا گیا ہے۔ اس لیے اپنے اختیار و اقتدار کو آزمانے یا شاید از سر نو جمانے کا مظاہرہ کرنے کی خاطر انہوں نے اصرار کر کے خالد صاحب کو ملاقات کے لیے طلب کیا تھا۔

انہی دنوں اچانک یہ افواہ بڑی تیزی سے گردش کرنے لگی کہ صدر ایوب پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور وہ اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے ہیں۔ اس افواہ کی تردید ایک تصویر سے کر دی گئی جو تقریباً تمام اخبارات میں شائع ہوئی۔ تصویر میں صدر ایوب ڈریسنگ گاؤن پہنے مغربی پاکستان کے گورنر جنرل موسیٰ کے ساتھ گفتگو میں مصروف دکھائے گئے۔ اس کے باوجود بہت سے لوگ اس تصویر کو جعلی شعبدہ بازی سمجھ کر اسی خوش فہمی میں رہنے پر مصر تھے کہ مفلوج ہو کر صدر ایوب اب کسی کام کے نہیں رہے۔

لیکن ایسے حلقوں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی جب یکم اپریل ۱۹۶۸ء سے صدر ایوب نے قوم کے نام ریڈیو اور ٹی وی سے اپنے ماہانہ خطاب کا سلسلہ از سر نو جاری کردیا۔ پہلے اعلان ہوا کہ ۲۳ مارچ کو یوم پاکستان کے موقع پر مسلح افواج کی پریڈ کی سلامی بھی وہ خود ہی لیں گے۔ لیکن ناتوانی کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکے۔ اس روز پریڈ کی سلامی وزیر دفاع ایڈمرل اے آر خاں نے لی۔ جنرل یحییٰ خان ان کے ساتھ بھیگی بلی بنے کھڑے رہے۔

بیماری سے جانبر ہو کر جب صدر ایوب دوبارہ کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے تو ان پر یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی تھی کہ ان کے اقتدار کا سرچشمہ ان کا اپنا بنایا ہوا آئین یا بنیادی جمہوریت کا نظام یا قومی اسمبلی یا مرکزی کابینہ نہیں' بلکہ ان کے صدارتی وجود اور عہدے کی شہ رگ کلیتہ کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ کی مٹھی میں ہے۔ جس آئین کے تحت انہوں نے صدارت کا حلف اٹھایا تھا' اس میں صاف طور پر درج تھا کہ

For more books visit www.4Urdu.com

بیماری کی صورت میں اگر مملکت کا سربراہ اپنے فرائض ادا کرنے سے معذور ہو جائے تو قومی اسمبلی کا سپیکر ان کی قائم مقامی کرے گا۔ صدر ایوب ڈیڑھ دو ماہ تک صاحب فراش رہے۔ لیکن اس تمام عرصہ میں قومی اسمبلی کے سپیکر عبدالجبار خاں سے کسی نے یہ تک نہ پوچھا کہ میاں تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ بیماری کے ابتدائی چند ایام میں جب صدر ایوب زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہے تھے' اس وقت جنرل یحییٰ خاں ان کے تن بدن پر بنفس نفیس منڈلاتے رہے کہ جونہی یہ ٹھنڈا ہو تو وہ فوراً گدھ کی طرح اس پر جھپٹیں۔ ان کی یہ امید تو بر نہ آئی لیکن موت کا خطرہ ٹلنے کے باوجود صدر ایوب مزید پانچ چھ ہفتے اپنے فرائض منصبی سر انجام دینے سے قطعاً معذور رہے۔ اس طویل عرصہ میں انہوں نے ایک بار بھی ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہ کیا کہ اپنے نافذ کردہ آئین کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر وہ قومی اسمبلی کے سپیکر کو چند روز کے لیے اپنی قائم مقامی کا موقع عطا فرما دیں۔ یا ممکن ہے کہ جنرل یحییٰ کے تیور دیکھ کر وہ اس طرح کا کوئی ارادہ زبان پر لانے ہی سے باز رہے ہوں۔

بیماری سے اٹھنے کے بعد ڈاکٹروں نے صدر ایوب کو دن میں چند بار دواؤں کی متعدد گولیاں پابندی سے کھانے پر لگا دیا تھا۔ غالباً ان میں کچھ سکون آور دواؤں (Tranquilizer) کا عنصر بھی شامل تھا۔ جس کی وجہ سے ان پر ہمہ وقت کسی قدر غنودگی' آلکس اور سستی سی چھائی رہتی تھی۔ امور سلطنت میں ان کی روایتی سوجھ بوجھ' اثر پذیری اور ذہنی رد عمل کی صلاحیت بڑی حد تک ماند پڑ گئی تھی۔ اور کئی معاملات میں صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی قوت فیصلہ بھی کسی قدر متاثر ہوئی ہے۔ یہ حالت تین چار ماہ کے قریب رہی۔ اس کے بعد جولائی کے مہینے میں وہ لندن گئے۔ کچھ علاج معالجہ ہوا۔ چند روز مضافات میں ایک خوبصورت مقام پر آرام فرمایا۔ اور جب وہ واپس لوٹے تو ان کی خود اعتمادی اور صحت پوری طرح بحال ہو چکی تھی۔ اسلام آباد میں چند وزیروں کی ایک محفل میں انہوں نے اپنی صحت کے متعلق استفسار کے جواب میں انتہائی خود اعتمادی سے کہا۔ "نامی گرامی ڈاکٹروں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اگر میں مناسب احتیاط سے کام لوں تو مزید

For more books visit www.4Urdu.com

پچیس برس تک اس عہدے کا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔"

اسی زمانے میں صدر ایوب کے دور کی ترقی کا دس سالہ جشن بھی اپنے عروج پر تھا۔ یہ کارروائی ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۷ء سے شروع ہو چکی تھی اور اس تقریب کو مسلسل ایک برس تک منایا گیا۔ سرکاری دفتروں میں اسٹیشنری سے لے کر ریڈیو' ٹیلیویژن' اخبارات اور نشر و اشاعت کے دیگر تمام ذرائع بھی سال بھر اسی جشن کا اشتہار بنے رہے۔ تمام سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی پیشانی پر ایک ہی نعرہ ثبت تھا۔

The Great Decade of Development and Reform

اخبارات باری باری اپنے ضمیمے شائع کرتے تھے۔ جن میں بینکوں' زراعت' آبپاشی' ریلوے' جہاز رانی' تجارت' صنعت و حرفت کے علاوہ سیاست' ثقافت' آئین اور نظم و نسق کے جملہ شعبوں میں تعمیر و ترقی کے تفصیلی نقوش اجاگر کئے جاتے تھے۔ بعض اخبارات کے ایک ایک شمارے میں اکثر و بیشتر صدر ایوب کی آٹھ یا دس یا اس سے بھی زیادہ تصاویر شائع ہوتی تھیں۔ شروع شروع میں کچھ لوگوں نے ایک معقول حد تک تو اس مہم میں دلچسپی کا اظہار کیا لیکن جب یہ سلسلہ حد سے زیادہ دراز ہوتا چلا گیا اور دن رات چاروں طرف یہی ڈھنڈورہ پیٹنے کی آواز سنائی دینے لگی' تو لوگ اس سے تنگ آ کر اکتا گئے۔ رفتہ رفتہ اس کا مذاق اڑنے لگا۔ اور اس پر طرح طرح کی پھبتیاں کسی جانے لگیں۔ اس پر بھی یہ مہم بدستور جاری رہی۔ تو لوگ اس سے چڑنے اور گھن کھانے لگے۔ جس زمانے میں یہ مہم ایوب خاں کے دور کی برکتوں کے قصیدے الاپنے میں مصروف تھے۔ بد قسمتی سے اسی زمانے میں آٹا' چاول' چینی اور دالوں کے دوسری بہت سی اشیائے خورد کی قیمتوں میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ گرانی کے علاوہ ان اشیاء کی قلت بھی بار بار رونما ہونا شروع ہو گئی تھی۔ خاص طور پر کراچی میں آٹا اور میدہ کی قیمت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہاں کی بیکریوں نے ایک روز احتجاج کے طور پر مکمل ہڑتال کر دی۔ چینی کی شدید گرانی اور قلت کے پیش نظر کراچی اور لاہور میں چینی کی راشن بندی کر دی گئی۔ مرکزی وزیر تجارت نواب عبدالغفور خاں ہوتی کے اس اقدام پر بہت

For more books visit www.4Urdu.com

سی الزام تراشیاں ہوئیں۔ اور عوام الناس میں ان کا لقب "چینی چور" مشہور ہو گیا۔ یوں بھی عوام میں ان پر کئی طرح کے آوازے کسے جانے لگے۔ ایک آوازہ جس نے کافی زور پکڑا' یہ تھا۔ "عبدالغفور ہوتی ------ ایوب خاں دی کھوتی" ڈھاکہ میں لوگوں نے شہید مینار کے سامنے ایک خستہ حال ہڈیوں کا انسانی ڈھانچہ آویزاں کر رکھا تھا جو ترقی و اصلاحات کے جشن کا دن رات منہ چڑاتا رہتا تھا۔

اشیاء کی گرانی اور قلت کے ان ہنگاموں میں ایوبی دور کے دس سالہ کارناموں کا ذکر بے معنی نظر آنے لگا۔ اور جس حد تک وہ نیک نامی' عزت اور وقعت کے جائز طور پر مستحق تھے' وہ بھی انہیں خاطر خواہ طور پر نصیب نہ ہو سکی۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو عرصہ سے موقع کی تاک میں بیٹھے تھے۔ لوہا گرم دیکھ کر انہوں نے ہتھوڑے کی ضرب لگائی اور صدر ایوب کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کر دیا۔ ماحول کی سازگاری کے علاوہ انہیں جی ایچ کیو کے چند عناصر کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ ان میں جنرل یحییٰ خاں کے دست راست میجر جنرل پیر زادہ کا نام سر فہرست تھا۔ یہ صاحب ایک زمانے میں صدر ایوب کے ملٹری سیکرٹری رہ چکے تھے۔ وہاں پر انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تو صدر ایوب نے انہیں واپس جی ایچ کیو بھیج دیا۔ اس پر پیرزادہ صاحب صدر سے ناراض ہو گئے اور ان کے خلاف اپنے دل میں شتر کینہ پال کر ان سے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ مسٹر بھٹو کے ساتھ ان کی پہلے سے کچھ راہ و رسم تھی۔ اب پیر زادہ نے اپنے ہتھکنڈوں سے ان پر یہ بات واضح کر دی کہ اگر انہوں نے صدر ایوب کے خلاف کوئی تحریک شروع کی تو وہ اس مہم میں تنہا نہ ہوں گے بلکہ پاکستانی فوج کا ایک بڑا عنصر بھی ان کی پشت پر ہو گا۔ اس ملی بھگت سے پیر زادہ کا مقصد مسٹر بھٹو کو بر سر اقتدار لانا نہیں تھا بلکہ ایوب خاں کے زوال کی خاطر انہیں ایک کٹھ پتلی کی طرح استعمال کر کے جنرل یحییٰ کی راہ ہموار کرنا تھا۔ اس قسم کی شاطرانہ دو رخی میجر جنرل پیر زادہ کی عیاری اور زمانہ سازی کا طرۂ امتیاز تھی۔ جب صدر ایوب انہیں اپنا ملٹری سیکرٹری بنا کر ایوان صدر میں لا رہے تھے' تو ایک روز میں نے ان سے پوچھا تھا۔ "نیا ملٹری سیکرٹری کیسا

For more books visit www.4Urdu.com

شخص ہے؟" صدر ایوب نے مسکرا کر جواب دیا۔ "خچرا آدمی ہے۔" پنجابی زبان کی یہ فصیح و بلیغ اصطلاح میجر جنرل پیر زادہ کی ذات پر یوں چسپاں ہوتی ہے جیسے دنبے کے بدن پر کھال مڑھ ہوئی ہوتی ہے۔

URDU4U.COM

چنانچہ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۸ء کے روز مسٹر بھٹو نے حیدر آباد (سندھ) میں ایک جلسہ عام منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جلسہ عام کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ تو لوگ جوق در جوق ایک پرائیویٹ احاطے میں جمع ہو گئے۔ وہاں پر بھٹو صاحب نے ایک تیز و تند تقریر میں قسم کھائی کہ وہ صدر ایوب کو مسند اقتدار سے اتارے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ انہوں نے ایوبی دور حکومت پر شدید نکتہ چینی کے علاوہ صدر ایوب کی ذات پر بھی بزدلی' بد دیانتی' خیانت' اقرباء پروری اور سیاسی بد نیتی کے بے شمار الزام لگائے۔ اس کے بعد مسٹر بھٹو کی ہر تقریر میں ان دھمکیوں اور الزامات کے علاوہ معاہدہ تاشقند پر بھی نہایت کڑی تنقید ہوتی تھی اور وہ ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کرتے تھے کہ وہ عنقریب اس معاہدہ کی چند ایسی خفیہ شقوں کا بھانڈہ پھوڑنے والے ہیں جو انتہائی چالاکی سے اب تک صیغہ راز میں رکھی گئی ہیں۔ اس الزام تراشی کا جواب دینے کے لیے سوویت یونین نے صدر ایوب کے حق میں ایک غیر معمولی حکمت عملی کا مظاہرہ کیا۔ روس کی سرکاری خبر رساں ایجنسی "تاس" نے یہ تردید شائع کی کہ معاہدہ تاشقند میں کسی قسم کی کوئی خفیہ شق ہی موجود نہیں ہے۔ لیکن لوگوں نے اس تردید کو کوئی وقعت نہ دی۔ چاروں طرف بھٹو صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کا منہ بند کرنے کے لیے صوبائی اور مرکزی حکومت نے طرح طرح کے حربے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ مغربی پاکستان کے گورنر جنرل موسیٰ اور کئی وزیروں نے پہلے تو دھمکی آمیز اور جارحانہ تقریروں سے مسٹر بھٹو کو دبانا چاہا۔ جب اس سے کام نہ بنا تو لاڑکانہ اور سکھر کی عدالتوں میں ان کے خلاف اراضیات وغیرہ کے متعلق تفتیشات اور مقدمات دائر کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے علاوہ مغربی پاکستان کے غنڈہ آرڈیننس میں ایک ایسی ترمیم لائی گئی جس کی رو سے تقریباً ۲۶ قسم کے مختلف افراد "غنڈہ" کے زمرہ

For more books visit www.4Urdu.com

میں آ گئے۔ اس ترمیم کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے ناقدین اور مخالفین کو نہایت آسانی سے غنڈہ قرار دے کر قانون کے شکنجہ میں لایا جا سکے۔ شروع شروع میں مسٹر بھٹو کے کچھ ساتھی اس آرڈی ننس کی زد میں آئے لیکن یہ حربہ بھی زیادہ موثر ثابت نہ ہو سکا۔ کیونکہ ملک میں طلباء کی بڑھتی ہوئی بد نظمی اور بد امنی دن بہ دن اپنا رنگ لا رہی تھی۔ ۱۹۶۸ء کے وسط ہی سے طالب علموں کی ہنگامہ آرائی اپنے زوروں پر تھی اور اکثر سکول اور کالج زیادہ تر بند رہتے تھے۔ اس وجہ سے پرائیویٹ اداروں کے اساتذہ کی اکثریت بھی اپنی تنخواہوں سے محروم رہتی تھی۔ تنگدستی سے مجبور ہو کر وہ بھی طلباء اور عوام کے احتجاجی مظاہروں میں برضا و رغبت شریک ہونے لگے۔ اور ان کی دیکھا دیکھی بہت سے دوسرے شعبوں اور اداروں کے محنت کشوں کی دلچسپی اور ہمدردی بھی صدر ایوب کے خلاف پھیلتی ہوئی فضا میں شامل ہوتی گئی۔

پھر اچانک ۷ نومبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی میں ایک المناک واقعہ رونما ہوا۔ طلباء کا ایک گروپ طورخم وغیرہ کی سیاحت سے واپس آ رہا تھا۔ راولپنڈی پولی ٹیکنیک پہنچتے ہی پولیس نے انہیں روکا اور الزام لگایا کہ وہ لنڈی کوتل کی باڑہ مارکیٹ سے بہت سا سامان اسمگل کر رہے ہیں۔ اس لیے ان کی تلاشی لی جائے گی۔ یہ ایک بندھا بندھایا معمول تھا کہ بہت سے سیاح لنڈی کوتل کے باڑہ بازار سے کچھ خرید و فروخت کا سامان اپنے ساتھ لایا کرتے تھے اور ان سے کبھی کوئی باز پرس نہ کی جاتی تھی۔ اس دستور کے برعکس جب پولیس نے طلباء کی تلاشی لینے پر اصرار کیا تو انہوں نے مشتعل ہو کر ہنگامہ برپا کر دیا۔ پولی ٹیکنیک کے بہت سے طالب علم بھی اس میں شامل ہو گئے۔ پولیس نے جی بھر کر لاٹھی چارج اور آنسو گیس کا استعمال کیا۔ جب اس سے صورت حال قابو میں نہ آ سکی تو انہوں نے گولی چلا دی جس سے ایک نوجوان طالب علم عبدالحمید جاں بحق ہو گیا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو برق رفتاری سے موقع واردات پر پہنچے۔ انہوں نے مرحوم عبدالحمید

For more books visit www.4Urdu.com

کی لاش کو اس کے آبائی گاؤں پنڈی گھیب پہنچانے کے لیے ایک زبردست جلوس ترتیب دیا۔ اس طرح راولپنڈی کے گرد و نواح میں ساٹھ ستر میل تک جس جس گلی یا گاؤں یا قریہ سے یہ ماتمی جلوس گزرا' وہاں پر صدر ایوب کی قسمت کا ستارہ ڈوبتا چلا گیا۔

URDU4U.COM

یوں بھی جواں سال عبدالحمید کا خون ناحق بہتے ہی ملک کا گوشہ گوشہ بد امنی اور شورش کے لا متناہی طوفان کی زد میں آ گیا۔ ۷ نومبر ۱۹۶۸ء سے لے کر ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو صدر ایوب کی معزولی تک کوئی ایسا دن نہ گزرا جب کہیں نہ کہیں طلباء اور عوام کے جلسے' جلوس' توڑ پھوڑ' لوٹ مار' پتھراؤ' گھیراؤ یا جلاؤ وغیرہ کے واقعات رونما نہ ہوئے ہوں۔ عبدالحمید کی موت کے دوسرے روز راولپنڈی میں عوام کا غم و غصہ انتہائی شدت اختیار کر گیا۔ پولیس کی فائرنگ سے دو اور افراد موت کے گھاٹ اتر گئے۔ عوامی غیظ و غضب کے سامنے پولیس بے دست و پا ہو گئی تو امن قائم رکھنے کے لیے فوج کو میدان میں اتارا گیا۔ لیکن بہت جلد یہ راز کھل گیا کہ فوجی افسروں کو در پردہ ہدایت تھی کہ صدر ایوب کے خلاف مظاہرے کرنے والوں پر کسی قسم کی کوئی سختی نہ کی جائے۔ چنانچہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باوجود لوگ ہزاروں کی تعداد میں بھٹو صاحب کی تقریریں سننے کے لیے جلسوں اور جلوسوں میں شامل ہوتے رہے۔ انہی دنوں مختلف شہروں کی دیواروں پر ایک اشتہار چسپاں پایا گیا۔ جس میں پاکستان کی بری فوج کے کمانڈر انچیف کے نام اپیل تھی کہ ملک میں امن و سلامتی برقرار رکھنے کے لیے جنرل یحییٰ کو فوراً عنان حکومت اپنے ہاتھ میں سنبھال لینی چاہیے۔ خفیہ اداروں کے ذرائع نے انکشاف کیا کہ اس کارستانی کے پیچھے اسٹینڈرڈ بنک کے مالک مسٹر علوی کا ہاتھ ہے۔ یہ صاحب جنرل یحییٰ کے لنگوٹئے یار تھے۔ اور ان دونوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت بہت سی چہ میگوئیوں کا دل پسند موضوع تھی۔

عبدالحمید کی موت کے چار روز بعد ۱۱ نومبر کو پشاور میں صدر ایوب پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا۔ وہ ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے کہ اچانک سامعین میں سے ایک نوجوان

For more books visit www.4Urdu.com

ہاشم نامی اٹھا اور اس نے پستول تان کر ان کی طرف دو فائر کئے۔ نشانہ خطا گیا۔ یوں بھی صدر ایوب نے اپنی فوجی مہارت سے کام لے کر ڈائس پر گولی روک کر روسٹرم کے پیچھے بر وقت پناہ لے لی تھی۔ فوج کے ایک پنشنر صوبیدار نے حملہ آور پر قابو پا کر اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اس کارگزاری کے صلے میں اسے دس ہزار روپے کا نقد انعام دیا گیا۔

اس کے دو روز بعد مسٹر بھٹو اور خان عبدالولی خاں کو دوسرے بہت سے اہم سیاستدانوں سمیت ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ ان گرفتاریوں نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ مغربی پاکستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں شدید ہنگاموں نے مزید زور پکڑ لیا۔ جگہ جگہ پولیس اور مظاہرین کے درمیان تصادم کے واقعات بڑھ گئے اور نہتے عوام پر پولیس کی زیادتیوں کی داستانیں زبان زد خاص و عام ہو گئیں۔ کئی مقامات پر کچھ لوگوں نے لاٹھی چارج اور آنسو گیس سے بچنے کے لیے بھاگ کر مسجدوں میں پناہ لی' تو پولیس نے وہیں جا کر انہیں بیدردی سے زد و کوب کیا۔ ایسے ہنگاموں کے دوران ایک دو جگہ قرآن حکیم کی بے حرمتی کی خبریں بھی سننے میں آئیں۔ خاص طور پر کراچی کی آرام باغ والی مسجد کا واقعہ بہت بدنام ہوا۔ جس میں جوتوں سمیت گھس کر پولیس نے بعض لوگوں کو اس قدر پیٹا کہ مسجد کا فرش تک لہولہان ہو گیا۔

یوں تو وطن عزیز میں ہماری پولیس پہلے بھی کبھی نیک نام نہ تھی' لیکن اس قسم کے تشدد آمیز واقعات نے عوام کے دل میں اس کے خلاف اور بھی زیادہ نفرت پھیلا دی۔

اس کے بعد اچانک کھاریاں میں خانم کے سانحہ کی خبر نکلی جس نے صدر ایوب کی حکومت کے آخری ایام پر ایک عجیب بے برکتی کا سایہ ڈال دیا۔ خانم ایک سولہ برس کی جوان لڑکی تھی جو اپنے ماں باپ اور چھوٹے بھائی کے ہمراہ کسی قتل کی تفتیش کے سلسلے میں کھاریاں پولیس اسٹیشن میں لائی گئی تھی۔ رات کو پولیس والے اسے ایک الگ کوٹھڑی میں لے گئے۔ جہاں سے ساری شب اس کے چیخنے اور چلانے کا شور سنائی

For more books visit www.4Urdu.com

دیتا رہا۔ صبح کے وقت وہ اپنی کوٹھڑی میں مردہ پائی گئی۔ پولیس والوں کا کہنا تھا کہ اس نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی ہے۔ لیکن میڈیکل رپورٹ نے یہ ثابت کر دیا کہ کثیر التعداد لوگوں نے خانم کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔

اسی زمانے میں کئی اور شہروں میں بھی جنسی بے راہروی کی بہت سی خبریں آندھی کی طرح اٹھیں اور بگولوں کی طرح پھیل گئیں۔ خبریں اس قسم کی تھیں کہ چند بڑے بڑے مخصوص اور با اقتدار خاندانوں کے نوجوان دن دیہاڑے شریف اور باعزت گھرانوں میں گھس کر ان کی لڑکیاں زبردستی اٹھا لاتے تھے۔ اور پولیس ڈر کے مارے ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاتی تھی۔ غالباً ان خبروں میں حقیقت کم اور افواہ سازی کا عنصر زیادہ ہوتا تھا۔ لیکن انہوں نے ماحول کی کثافت اور غلاظت کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ ان خبروں اور افواہوں میں جتنا بھی تھوڑا بہت حقیقت کا عنصر تھا' اس نے صدر ایوب کے آخری ایام حکومت کی بے برکتی میں بہت زیادہ ظلمت کو فروغ دیا۔

دوسری جانب مشرقی پاکستان کو بھی عوام الناس نے اسی طرح اپنے غیظ و غضب کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ پہلے وہاں پر یہ خبر نکلی کہ اگرتلہ سازش کے ایک ملزم فلائیٹ سارجنٹ ظہور الحق کو فوج کی حراست میں گولی مار کر سنگینوں سے ہلاک کر دیا گیا ہے۔ الزام یہ لگایا گیا کہ وہ جیل سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کسی کو اس الزام کی صداقت پر یقین نہ آیا۔ عام خبر یہی تھی کہ وہ حراست کے دوران وحشیانہ تشدد کا شکار ہو کر مرا ہے۔ اس پر صوبہ بھر میں جگہ جگہ فساد شروع ہو گئے۔ ڈھاکہ میں مشتعل عوام نے دو وزیروں کے گھروں کو آگ لگا دی۔ ایک ہجوم نے اس سرکاری مہمان خانے پر ہلہ بول دیا۔ جہاں پر اگرتلہ سازش کیس ٹریبونل کے صدر جسٹس ایس اے رحمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ کھلنا میں ایک مرکز وزیر خان عبدالصبور خاں کے مکان

For more books visit www.4Urdu.com

کو نذر آتش کر دیا گیا۔ راج شاہی یونیورسٹی کے طلباء نے ایک احتجاجی جلوس نکالنے کی کوشش کی۔ یونیورسٹی کے ایک ہر دلعزیز استاد ڈاکٹر شمس الضحیٰ نے انہیں یونیورسٹی کے صدر دروازے پر روک لیا۔ اور طلباء کو سمجھا بجھا کر منتشر ہو جانے کی تلقین کر ہی رہے تھے کہ ایک سپاہی نے جھپٹ کر انہیں اپنی سنگین پر دھر لیا اور مار مار کر اسی جگہ ہلاک کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں فلائٹ سارجنٹ ظہور الحق اور ڈاکٹر شمس الضحیٰ کے نام شہیدوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔ اور عوام نے جگہ جگہ پولیس اور فوج کے نافذ کردہ کرفیو کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ کئی مقامات پر بنیادی جمہوریت کے اراکین کو پکڑ کر بر سر عام پیٹا گیا۔ چند ایک جان سے بھی مارے گئے۔ کسی کسی جگہ ان کی رہائش گاہوں یا دکانوں یا یونین کونسلوں کے دفاتر کو توڑ پھوڑ کر آگ لگا دی گئی۔ لوگوں کے اس تیز و تند سیلاب کے سامنے بے بس ہو کر کچھ ممبر مستعفی ہو کر روپوش ہونا بھی شروع ہو گئے تھے۔

فروری کے وسط میں ایک روز صدر ایوب نے مجھے ایک سرکاری فائل کے ساتھ اپنے دفتر میں طلب کیا۔ جس وقت میں ایوان صدر پہنچا تو ایک نامی گرامی عالم دین ملاقات کے بعد ان کے کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ اندر جا کر میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر غیر معمولی شکستہ دلی کے آثار نمایاں ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک لمبا چوڑا کاغذ تھا جس پر عربی اور اردو میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ غالباً میرے آنے سے پہلے والے ملاقاتی انہیں بہت سے وظائف پڑھنے کے لیے دے گئے تھے۔ صدر نے کسی قدر بے دلی سے اس کاغذ کو میز کی دراز میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "سب یہی کہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ تاریخ اپنے آپ کو منسوخ کرنے کے لیے بھی دہراتی ہے۔"

چند لمحے توقف کرنے کے بعد وہ یوں گویا ہوئے۔ "تمہیں یاد ہو گا کہ ۱۹۶۲ء کی فروری میں مسلح افواج کے اعلیٰ افسر مجھ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ آئین نافذ کرنے کا نام نہ لو۔ سیاستدانوں کے قریب تک نہ جاؤ۔ اور اسی طرح مارشل لاء کے سائے میں بیٹھ کر

For more books visit www.4Urdu.com

ہنسی خوشی حکومت کرتے رہو۔ اور آج سات برس بعد اسی مہینے میں وہی لوگ مجھے مشورہ دے رہے ہیں کہ سیاستدانوں کو مناؤ۔ ان کی منت سماجت کر کے ان کے ساتھ سب معاملات فوراً طے کرو ورنہ حالات قابو سے نکل جائیں گے۔"

"اب آپ نے کیا سوچا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"سوچنے کے لیے میرے پاس اب رہ ہی کیا گیا ہے؟" صدر ایوب تلخی سے بولے۔ "میرا خیال ہے کہ اگلے چند روز انتہائی نازک اور فیصلہ کن ہوں گے۔"

اس روز مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ صدر ایوب مسلح افواج کی حمایت سے قطعی طور پر ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ باہر چاروں طرف شورش اور بد امنی کا زور بدستور بڑھ رہا تھا۔ ایک روز پشاور میں لوگوں نے خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر کو جلا کر راکھ کر دیا۔ پھر ۱۴ فروری کو ملک بھر میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ سڑکوں پر نکلنے والی ہر بس' ٹرک' ویگن' ٹیکسی' موٹر سائیکل' تانگہ اور رکشا نے سیاہ ماتمی جھنڈے لہرائے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ میونسپل کارپوریشنوں' کمیٹیوں اور کئی دیگر سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی گاڑیاں بھی سیاہ جھنڈیاں لگائے ہوئے تھیں۔ اس روز جو گاڑی سیاہ جھنڈی لہرائے بغیر باہر نکلتی تھی اس پر پتھراؤ کر کے اسے توڑ پھوڑ دیا جاتا تھا۔ راولپنڈی شہر میں چند موٹر کاریں ہجوم نے نذر آتش بھی کر دیں۔ چند سینئر افسر اسٹاف کاروں میں بیٹھے مری روڈ سے گزر رہے تھے تو لوگوں نے انہیں روک لیا اور ان سے "ایوب کتا مردہ باد" کے نعرے لگوا کر آگے بڑھنے دیا۔ ڈیوٹی پر متعین پولیس ڈر کے مارے بے بس تھی اور سڑکوں پر گشت کرتی ہوئی فوج بھی خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔ ہڑتال والے دن لاہور' کراچی اور حیدر آباد میں شدید ہنگامے اور تصادم بھی ہوئے اور بہت سے لوگ مارے گئے۔

اسی روز مسٹر بھٹو نے ۱۹۶۵ء سے نافذ شدہ ایمرجنسی کے خلاف تادم زیست بھوک ہڑتال شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔

ان حالات سے مجبور ہو کر صدر ایوب نے ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی کے صدر نوابزادہ نصراللہ خاں کو دعوت دی کہ وہ اپنی پسند کے ساتھوں سمیت ۱۷ فروری کو ایک راؤنڈ ٹیبل

For more books visit www.4Urdu.com

کانفرنس میں ان سے آ کر ملیں۔ نوابزادہ صاحب نے شرائط عائد کیں کہ یہ ملاقات اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ڈیفنس آف پاکستان رولز اور ایمرجنسی کا نفاذ فوراً ختم کیا جائے' جلسوں اور جلوسوں پر دفعہ ۱۴۴ کی پابندی اٹھا لی جائے' اور تمام گرفتار شدہ طلباء اور سیاسی کارکنوں کو رہا کیا جائے۔ موقع شناسی سے کام لے کر صدر ایوب نے ان کی بہت سی شرائط مان لینے کی ٹھان لی۔ اور ایک تجربہ کار فوجی کی طرح نہایت منظم طور پر اپنے ہتھیار ڈالنا شروع کر دیئے۔ پہلے انہوں نے ایمرجنسی ختم کرنے کا اعلان کیا۔ پھر ڈیفنس آف پاکستان رولز اٹھائے۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر بھٹو سمیت سب سیاستدان اور سیاسی قیدی رہا ہو گئے۔ مشرقی پاکستان کی دلجوئی کے لیے انہوں نے روزنامہ اتفاق کے چھاپہ خانہ کی ضبطی کا وہ حکمنامہ منسوخ کر دیا جو تین برس قبل جاری ہو چکا تھا۔ صدر ایوب نے شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی پیرول پر رہا کر کے راولپنڈی میں دوسرے سیاستدانوں کے ساتھ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ شیخ صاحب نے یہ دعوت قبول کر لی اور انہیں راولپنڈی لانے کے لیے ایک خصوصی طیارہ بھی ڈھاکہ کی ائیر پورٹ پر تیار ہو کر آ کھڑا ہوا۔ لیکن سیاست دانوں اور صدر ایوب کے درمیان صلح صفائی کی یہ پیش رفت جنرل یحییٰ' میجر جنرل پیر زادہ اور ان کے ہم خیال ٹولہ کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ چنانچہ انہوں نے فی الفور اپنے ہتھکنڈے استعمال کر کے اس پیش رفت کو سبوتاژ کر دیا۔ ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمٰن اگرتلہ سازش کیس کے سلسلہ میں فوجی حراست میں تھے وہاں پر کچھ ایسے تار ہلائے گئے کہ وہ پیرول پر راولپنڈی آنے سے اچانک مکر گئے۔ اب انہیں یہ ضد ہو گئی کہ وہ ایک زیر حراست قیدی کی حیثیت سے کسی مذاکرات میں ہرگز شرکت نہ کریں گے۔ ان کو رام کرنے کے لیے حکومت نے اگرتلہ سازش کا مقدمہ عدالتی ٹربیونل سے واپس لے لیا۔ یہ مقدمہ واپس ہوتے ہی شیخ مجیب الرحمٰن سمیت سازش کیس کے سارے ملزم رہا ہو گئے۔

سیاستدانوں کے ساتھ مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کے لیے صدر ایوب نے اپنے بنائے ہوئے

For more books visit www.4Urdu.com

آئین سے بھی ہاتھ اٹھا لیا اور برملا اعلان کر دیا کہ عوام کے نمائندے اپنی مرضی کا نیا آئین ملک میں نافذ کرنے کے لیے قطعی طور پر آزاد ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے قوم کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ اگلے صدارتی انتخابات میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑے نہ ہوں گے۔

اس پس منظر میں ۲۶ فروری ۱۹۶۹ء کو صدر ایوب اور سیاستدانوں کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی کے اراکین کے علاوہ شیخ مجیب الرحمٰن اور ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خاں شریک ہوئے۔ مسٹر بھٹو اور مولانا بھاشان نے کانفرنس میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ ابتدائی گفتگو کے بعد کانفرنس کا اگلا اجلاس ۱۰ مارچ تک ملتوی ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی صدر ایوب اور جنرل یحییٰ خاں کے درمیان ایک خاموش اور زیر زمین قسم کی زور آزمائی شروع ہو گئی۔ مسٹر بھٹو' مولانا بھاشانی اور ائیر مارشل اصغر خاں پر تو صدر ایوب کا کوئی بس نہ چلتا تھا۔ لیکن باقی سیاستدانوں کا دل ان کی جانب کسی قدر پسیجا ہوا تھا۔ جس انداز سے صدر ایوب نے یکے بعد دیگرے ان کی سب شرائط مان لی تھیں۔ اس سے متاثر ہو کر جملہ سیاستدان ان کے ساتھ کوئی فیصلہ کن گفتگو کرنے پر آمادہ تھے۔ لیکن مذاکرات کی اصل کنجی شیخ مجیب الرحمٰن کے ہاتھ میں تھی۔ ان کو اپنی راہ پر لانے کے لیے صدر ایوب نے کافی ہاتھ پاؤں مارے۔ مشرقی پاکستان کے گورنر عبدالمنعم خان کی جگہ انہوں نے شیخ مجیب کے ایک پسندیدہ سیاستدان اور اقتصادی ماہر ڈاکٹر ایم این ہدیٰ کو وہاں کا گورنر متعین کر دیا۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں بھی جنرل موسیٰ کی جگہ مسٹر یوسف ہارون کی تقرری بطور گورنر ہو گئی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ ہارون خاندان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ ہارون فیملی اور بھٹو فیملی کے درمیان بھی قدیمی دشمنی تھی۔ یوسف ہارون کو گورنر بنا کر غالباً صدر ایوب ایک تیر سے دو شکار کرنے کی امید رکھتے تھے۔ ان کی یہ کوششیں کسی حد تک رنگ بھی لائیں۔ اور پارلیمانی نظام حکومت اور عام بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر

For more books visit www.4Urdu.com

شیخ مجیب الرحمٰن راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں کوئی سیاسی سمجھوتہ قبول کرنے پر مائل بھی ہو گئے تھے لیکن جی ایچ کیو میں صدر ایوب کے مخالف ٹولہ نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔

URDU4U.COM

جنرل یحییٰ اور میجر جنرل پیر زادہ وغیرہ نے ڈھاکہ اور راولپنڈی میں اپنے ذرائع سے شیخ مجیب الرحمٰن کی یہ برین واشنگ کر دی کہ اس بڈھے (صدر ایوب) کے ہاتھ میں اب کوئی اقتدار باقی نہیں جسے وہ سمجھوتہ کرنے کے بعد سیاستدانوں کو منتقل کر سکے۔ اقتدار حاصل کرنے کا شوق ہے تو ہمارے ساتھ چلو۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے یہ بات اپنے پلے باندھ لی اور ۱۰ مارچ کو جب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس دوبارہ شروع ہوئی تو انہوں نے اپنے بریف کیس سے کاغذوں کا ایک پلندہ نکال کر ایک طویل اور کسی قدر بے ربط تقریر پڑھی جس میں ذکر تو ان کے چھ نکات کا تھا لیکن انجام علیحدگی اور تخریب پر مبنی تھا۔ اپنی تقریر ختم کرتے وقت شیخ صاحب نے زور دے کر کہا تھا کہ ان کی پیش کردہ تجاویز پر عمل کرنے ہی سے ملک سلامت رہ سکتا ہے۔

اس پر صدر ایوب نے برجستہ پوچھا تھا۔ "کون سا ملک؟"

اس رنگ اور سر پر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس تو ناکام ہو کر ختم ہو گئی لیکن ملک کے طول و عرض میں بد امنی اور ہنگاموں کا زور نہ ٹوٹنا تھا نہ ٹوٹا۔ بلکہ ان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ سول محکموں اور اداروں کی نمائندہ یونینیں اور انجمنیں بھی پنجے جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور انہوں نے اپنے حقوق منوانے' تنخواہیں بڑھوانے اور سی ایس پی وغیرہ کو ختم کروانے کی تحریک شروع کر دی۔ مغربی پاکستان میں ڈاکٹرز' اساتذہ' پوسٹل ملازمین' گودیوں کے مزدور اور دوسرے بہت سے محنت کش بھی ہڑتالوں پر چلے گئے۔ قدم قدم پر مار پیٹ قتل و خون' توڑ پھوڑ' گھیراؤ جلاؤ کے واقعات رونما ہونے لگے۔

ایک روز نیشنل بنک کے ہیڈ آفس میں چھوٹے ملازمین نے بنک کے سربراہ اور منیجنگ ڈائریکٹر کا آدھی رات تک گھیراؤ کر کے ان سے اپنے سب مطالبے زبردستی منظور کروا لیے۔

For more books visit www.4Urdu.com

اندرون خانہ ملک کی معیشت انتہائی شدید بحران میں مبتلا تھی۔ باہر امن عامہ کی چادر تار تار تھی۔ ایک مشتعل ہجوم نے کراچی ریس کورس پر حملہ کر کے وہاں پر ہر شے کو تہس نہس کر دیا۔ پی آئی ڈی سی' سرکاری' نیم سرکاری اور پرائیویٹ تجارتی اداروں کے علاوہ سب چھوٹی بڑی صنعتی ملیں اور فیکٹریاں بھی گھیراؤ اور جلاؤ کی زد میں آئی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے ملک کے اقتصادی نظام پر گہرا جمود چھا گیا۔ ۱۳ مارچ کو کراچی کا اسٹاک ایکسچینج بھی بند ہو گیا۔ ڈھاکہ میں آدم جی جوٹ ملز اور پاکستان تمبا کو کمپنی پر مزدوروں نے اپنا قبضہ جما لیا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کا شہر شہر' گلی گلی' کوچہ کوچہ "ایوب کتا ہائے ہائے" اور "ایوب کتا مردہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔ اس ماحول میں صدر ایوب نے کابینہ کا اجلاس بلایا جو ان کے عہد صدارت کی آخری کیبنٹ میٹنگ ثابت ہوئی۔ کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ کو اس میٹنگ میں خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ صدر نے ملک بھر میں پھیلی ہوئی بد امنی اور بد نظمی کا تجزیہ بیان کر کے یہ تجویز پیش کی کہ اس بگڑتی ہوئی صورت حال پر قابو پانے کا واحد طریقہ مارشل لاء کا نفاذ ہے۔ سب کی آنکھیں بری فوج کے کمانڈر انچیف کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ جب جنرل یحییٰ سے اس تجویز پر رائے طلب کی گئی تو انہوں نے یہ کہہ کر کنی کترا لی کہ وہ اس بارے میں صدر ایوب سے الگ بات کریں گے۔ اس کے بعد صدر ایوب کی آخری کابینہ کا آخری اجلاس ہمیشہ کے لیے برخاست ہو گیا۔

بعد ازاں تخلیہ میں صدر ایوب اور جنرل یحییٰ کے مابین جو گفتگو ہوئی اس کا براہ راست کسی کو کچھ علم نہیں البتہ بعض قرائن و شواہد سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ جنرل یحییٰ نے مارشل لاء نافذ کرنے کی حامی اس شرط پر بھری کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دیا جائے' صوبائی گورنروں کو ان کی کابینہ سمیت موقوف کر دیا جائے اور ۱۹۶۲ء کے آئین کو منسوخ قرار دیا جائے۔

صدر ایوب عاقل آدمی تھے۔ جنرل یحییٰ کا اشارہ پا گئے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر

For more books visit www.4Urdu.com

بن کر وہ خود صدارت کی کرسی سنبھالنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کی اپنی ذاتی مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اپنے پروردہ جنرل آغا محمد یحییٰ خاں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ چنانچہ ایوان صدر کے بند کمرے میں انہوں نے خاموشی سے بلا چوں و چراں ان کی ساری شرائط منظور کر لیں۔

URDU4U.COM

تین چار روز بعد میں نے سنا کہ پاکستان میں متعین امریکن سفیر اچانک ایک خصوصی پرواز سے واشنگٹن روانہ ہو گیا ہے۔ اسی شام ایک سفاتی تقریب میں چند غیر ملکی نامہ نگار ایک طرف کھڑے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک دو سے میری شناسائی تھی۔ ایک انگریز صحافی سے میں نے پوچھا۔ "پاکستان میں اس شدید بحران کے دوران یہ امریکی سفیر واشنگٹن کیا کرنے گیا ہے؟"

اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "کیوں نہیں؟ منتقلی اقتدار پر عملدرآمد سے پہلے واشنگٹن سے OK حاصل کرنا بھی تو لازمی ہے؟"

معلوم نہیں' اس کا یہ جواب فکاہیہ تھا یا سنجیدہ لیکن یہ حقیقت ہے کہ امریکی سفیر کے واپس آتے ہی ۲۵ مارچ کو صدارت کی کرسی بدل گئی۔ اس روز صبح دس بجے ایوان صدر میں صدر ایوب نے اپنا آخری پیغام ریڈیو اور ٹیلیویژن کے لیے ریکارڈ کروایا گیا۔ ریکارڈنگ کے دوران جنرل یحییٰ غمگین صورت بنائے ٹسوے بہانے کے انداز میں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جونہی ریکارڈنگ کے ٹیپ ان کے قبضہ میں آ گئے۔ ان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ وہ ہشاش بشاش جھومتے جھامتے کمانڈر انچیف ہاؤس واپس آئے۔ اپنے چند لنگوٹے دوستوں اور منظور نظر خواتین کو طلب کیا۔ شراب ناب کا دور چلا اور دیر تک سب نے "ہے جمالو" کی تان پر آپس میں مل جل کر دیر تک بھنگڑا ڈالا۔

۲۵ مارچ کو جنرل یحییٰ نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا۔ اسی روز مجھے سابق صدر ایوب کا ایک خط ملا جو درج ذیل ہے۔

President House، Rawalpindi
ٮ:th March، ٮٮٮٮ
From: Field Marshal، Muhammad ـyub Khan، N.Pk.، H.J.

For more books visit www.4Urdu.com

My Dear Shahab۔
You must have heard my broad cast to the nation today in which I announced my decision to reliquish office. I know that you must have been shoked by this and I deeply value your sentiments toward me. I assure you my decision was dicatated by only one consideration namely the need to preserve the unity and integrity of Pakistan. ال my life I have believed in cetrain principles and I could not compromise them merely to continue in office. ے senior funtionaries of Government you know that this country cannot exist and make progress without a viable centre. I could not possibly preside over the liquidation of Pakistan by agreeing to all manner of demands. It was through a strong entral Government that we were able to achieve a great deal during the last ن years. In this your personal contribution and the contribution of your colleagues has been tremendous۔ Today all civil servants are under pressure but they represent one of the most valuable assets of our national life. So۔ don't lose heart and continue to do your duty without fear. You must do your job whatever the conditions and I expect you to give full co-operation to the new regime. I have no doubt in my mind that you will be treated with respect and that you will receive a fair deal.
I part from you with a heavy heart because I have come to have great affection and regard for You. You worked with dedication and a tremendous sense of loyalty.
Your Sincerly۔

صدر ایوب کی شخصیت چنار کے درخت کی طرح خوبصورت' تنا ور اور شاندار تھی۔ لیکن گرتے گرتے اس کا تنا کافی حد تک کھوکھلا ہو چکا تھا۔

URDU4U.COM

ذاتی طور پر وہ نیکی' شرافت' عدل پسندی اور رحمدلی کے خوگر تھے۔ اقتدار میں آ کر انہوں نے ایک محنتی طالب علم کی لگن سے اپنا کام سیکھا۔ اور اس میں نمایاں مہارت حاصل کی۔ ان کی رگ رگ میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خارجہ پالیسیوں میں نئے زاویے قبول کر کے انہوں نے دنیا بھر میں پاکستان کا وقار بلند کیا۔ اندرون ملک انہیں زرعی اور صنعتی اور تجارتی ترقی کو بام عروج تک پہنچانے کا جنون تھا۔

For more books visit www.4Urdu.com

ان شعبوں میں انہوں نے اتنی کامیابی ضرور حاصل کی کہ بہت سے لوگ ان کے دور حکومت کو پاکستان کی مادی ترقی کا سنہری زمانہ کہتے ہیں۔

URDU4U .COM

سیاست میں وہ ناکام رہے۔

تینوں مسلح افواج نے بڑی حد تک ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ لیکن اقتدار کے آخری ایام میں ان کے پروردہ چند بڑے افسر ان کے ساتھ بیوفائی کر گئے۔ اقتدار سے علیحدگی کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کے ایام نہایت خاموشی اور وقار سے گزارے۔ بہت سے لوگوں کے دلوں میں ان کی اچھی اور خوشگوار یادیں ہمیشہ تازہ رہیں۔ اسلام آباد میں جب کبھی وہ عید کی نماز پڑھنے عید گاہ میں آتے تھے تو ایک بڑا ہجوم ان کے ساتھ گلے ملنے یا ہاتھ ملانے کے شوق میں انہیں گھیر لیتا تھا۔

ایک روز وہ راولپنڈی میں ایک کتابوں کی دکان سے باہر نکل رہے تھے تو کچھ طلباء نے انہیں گھیر لیا۔ ایک لڑکے نے کہا۔ "سر' آپ دوبارہ صدارت کیوں نہیں سنبھالتے؟"

ایوب خاں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بیٹا! اب ایوب کتا بڈھا ہو گیا ہے۔"

کئی جگہ ٹیکسیوں کے اندر' بسوں کے اڈوں پر اور چھوٹی چھوٹی دکانوں میں اب تک ان کی تصویریں آویزاں نظر آ جاتی ہیں۔ جب کبھی وطن عزیز پر کسی خطرے کے بادل منڈلانے لگتے ہیں تو کئی دیہاتی علاقوں میں فوجی وردی میں ملبوس پاکستان کا علم بلند کئے ایوب خاں کی تصویر کے نیچے ایک فلمی گیت کے یہ بول درج ہوتے ہیں۔

"تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد"

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• روزگار سفیر

جب مجھے سفیر ہالینڈ بھیجنے کا فیصلہ سنایا گیا تو مجھے یہ کرید لگ گئی کہ میں نوع انسانی کی اس جنس کے متعلق کچھ معلومات حاصل کروں جنہیں انگریزی میں "ڈپلومیٹ" اور اردو میں پہلے ایلچی کہا جاتا تھا اور اب سفارتکار کہتے ہیں۔

URDU4U.COM

اب تک میں نے سفیر حضرات کو سطحی طور پر کسی قدر بے اعتنائی سے زیادہ تر سرکاری تقریبات میں کھاتے پیتے یا ہوئی اڈوں پر استقبالیہ اور الوداعیہ موقعوں پر قطاریں بناتے دیکھا تھا۔ اگرچہ یہ لوگ اپنے اپنے ملک کی الگ الگ نمائندگی کرتے ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ عجیب الخلقت مخلوق ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے نظر آتی ہے۔ ان سب کی وضع قطع' تراش خراش' چال ڈھال' بول چال' لب و لہجہ اور بندھی بندھائی' پٹی پٹائی اصلاحات و تلمیحات و محاورات پر اس محدود چار دیواری کی واضح چھاپ لگی ہوتی ہے جسے عرف عام میں Diplomatic Enclave کہا جاتا ہے۔ عام طور پر ان کے چہروں پر ایک ایسی مستقل اور مصنوعی مسکراہٹ چسپاں ہوتی ہے جیسے کسی بڑھئی نے بسولی کا ٹانکا مار کر خشک لکڑی پر خط منحنی تراش دیا ہو۔ خوش طبعی اور زندہ دلی سے کھلکھلا کر ہنسنا ان کے آداب میں داخل نہیں' بلکہ موقع و محل یا ماحول کی رعایت سے ٹھٹھا لگانا یا ناک بھوں چڑھا کر منہ سکیڑنا اور شانے اچکانا ان کی عادت ثانیہ ہے۔ گفتگو میں وہ چھپاتے زیادہ اور بتاتے کم ہیں اور ذو معنی اور گنجلک بات کو ابہام کی سان پر چڑھانا ان کا خاص طرۂ امتیاز ہے۔ پروٹوکول کی رو سے سب سفیر برابر کا درجہ رکھتے ہیں لیکن چھوٹے ملک کے سفیر کی ایک پہچان یہ ہے کہ اس کی کار بہت بڑی ہوتی ہے۔ غریب ممالک کے سفیر اپنے سفارت خانوں پر امارت کا چونا لگانے کی مہارت حاصل کرتے ہیں۔ جس سفیر کا ملک جس قدر غیر اہم ہو گا' اسی تناسب سے وہ اپنی اہمیت قدر و منزلت اور وقار کے وزن تلے دب کر خمیدہ کمر نظر آنے کی کوشش میں لگا ہو گا۔ بڑے اور طاقتور

For more books visit www.4Urdu.com

ممالک کے سفیر بھی کسر نفسی سے کام لینا نہیں جانتے اور بشرط ضرورت سفارتی اکھاڑے میں اپنے مخصوص جوڈو کراٹے کے کرتب آزمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنواتے۔

URDU4U.COM

دراصل کچھ سفیر بہت جلد اپنی انفرادیت پس پشت ڈال کر اس خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کی ذات ان کے ملک کا نقش ثانی ہے۔ اس مماثلت کو نبھانے کے لیے بعض اوقات وہ ایسے ایسے مضحکہ خیز جتن کرتے ہیں کہ ان پر چلتے پھرتے انسانوں کی بجائے دیوار پر ٹنگے ہوئے نقشوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سفارت کاری کا فن یونانی علم الاصنام کے ایک دیوتا Herms کے زیر سایہ جنم لے کر پروان چڑھا تھا۔ یہ نہایت دلچسپ اور معنی خیز حسن اتفاق ہے کہ یونانی دیو مالا میں اسی نام کے دیوتا کو بیک وقت جھوٹوں' اٹھائی گیروں' آوارہ گردوں اور لچوں لفنگوں کا سرپرست بھی مانا جاتا ہے۔

قدیم یونان میں سفیروں کی کامیابی کا معیار صرف اتنا تھا کہ وہ طویل گفتگوؤں اور تقریروں میں فصاحت و بلاغت کے دریا تو ضرور بہائیں' لیکن ان میں معانی و مطالب کا شائبہ تک نہ آنے دیں۔ سلطنت روما میں حکومت اپنے مفاد میں معاہدے تیار کر کے دارالخلافہ میں متعین غیر ملکی سفیروں کو حکم دیتی تھی کہ وہ ان پر بلا چوں و چراں دستخط کر دیں۔ اگر کوئی سفیر کسی معاہدہ کو ماننے میں پس و پیش کرتا تھا' تو اسے باغی اور جاسوس قرار دے کر قید و بند کی حالت میں اس کے وطن واپس بھیج دیا جاتا تھا۔ معاہدوں پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے بعض اوقات سفیروں سے ضمانت کے طور پر یرغمالی بھی طلب کر لیے جاتے تھے۔

سفارت کاری کو سب سے پہلے کاروبار حکومت میں ایک باقاعدہ اور منظم شعبے کا درجہ دینے کا سہرا بزنطینی سلطنت کے سر ہے' لیکن قسطنطنیہ میں جتنے غیر ملکی سفیر متعین ہوتے تھے' ان کی نہایت کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ سفیروں کی رہائش کے لیے حکومت انہیں نہایت عالیشان حویلیاں فراہم کرتی تھی۔ جن میں داخل ہونے کے بعد وہ بڑی حد تک

For more books visit www.4Urdu.com

نظر بند قیدیوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ اگر کوئی سفیر باہر جانے کے لیے قدم اٹھاتا تھا' تو فوجی گارد سلامی دینے کے بعد اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ باہر سے بھی کسی شخص کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ آج کل کی طرح ہر زمانے میں عام شہریوں کا سفارت کانوں سے میل جول بڑھانا شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کئی ممالک میں اس جرم کی سزا قید تھی۔ یورپ میں ایک ملک ایسا بھی تھا جہاں پر سفارت خانوں سے میل جول رکھنے والا شہری تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ انگلستان کے حکمران کراموِیل نے اعلان کر رکھا تھا کہ ہاؤس آف کامنز کا جو ممبر کسی غیر ملکی سفارتکار سے بات چیت کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اسے پارلیمنٹ کی رکنیت سے فی الفور خارج کر دیا جائے گا۔

سفارت خانوں کے اخراجات ان کی افادیت کے پیش نظر ہمیشہ بھاری تصور کئے جاتے ہیں۔ ایک زمانے میں سفیروں کو کھلے بندوں تجارت کرنے کی اجازت تھی' لیکن یہ بندوبست دیرپا ثابت نہ ہوا' کیونکہ سفیر حضرات سرکاروں درباروں میں حاضری دینے کی بجائے اپنا زیادہ وقت منڈیوں اور بازاروں میں صرف کرنے لگے تھے۔ کچھ یورپین ممالک نے چھوٹے چھوٹے دستکاروں' کاریگروں اور اہل حرفہ کو سفارتی عہدوں پر مامور کر کے بھی دیکھا۔ فرانس کے ایک بادشاہ نے اپنے حجام کو سفارت کی کرسی پر بٹھایا۔ فلورنس کے حکمران نے ایک عطار کو یہی اعزاز بخشا۔ اس سے سفارت خانوں کے اخراجات میں تو ضرور نمایاں کمی واقع ہوئی۔ لیکن روم میں پاپائے اعظم نے صدائے احتجاج بلند کی کہ ان کے پاس جو سفیر بھیجے گئے ہیں' ان کا معیار زندگی اتنا پست ہے کہ ان کے تن بدن سے بدبو آتی ہے۔ اسی طرح انگلستان کے بادشاہ ہنری ہفتم نے ایسے سفیروں کو اپنے دربار سے نکال دیا جن کے کپڑوں میں جوئیں رینگتی تھیں اور جو نہانے دھونے کے عادی نہ تھے۔

اس تجربہ کی ناکامی کے بعد کچھ حکومتوں نے اعلیٰ حسب نسب کے ایسے امیر کبیر افراد کو چن چن کر اپنا سفیر مقرر کرنا شروع کر دیا۔ جو سفارت خانوں کے پورے اخراجات

For more books visit www.4Urdu.com

اپنی جیب سے پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ آرام پسند امراء میں اس مفت کی بیگار کو قبول کرنے سے کنی کتراتے تھے۔ بعض ممالک میں ایسے لوگوں پر بھاری جرمانے کئے جاتے تھے۔ بعض دوسرے ملکوں میں انہیں پولیس اور فوج کی نگرانی میں زبردستی ان کے سفارتی عہدوں پر روانہ کر دیا جاتا تھا۔

مختلف زمانوں میں سفارت کاری کے آداب اور معیار بھی مختلف رنگ اختیار کرتے رہے ہیں۔ ایک زمانے میں سفارتی مشن کی وقعت اور اہمیت کا دار و مدار ان بیش بہا اور نادر تحفوں پر ہوتا تھا جو شاہی دربار میں پیش کئے جاتے تھے۔ بعد ازاں تحفوں تحائف کی جگہ سفیروں کا ذاتی جاہ و جلال اور حسن و جمال رنگ لانے لگا۔ اٹھارہویں صدی کے آخیر میں انگلستان نے روس میں اپنا ایک ایسا سفیر متعین کیا جو مردانہ حسن صورت میں یوسف ثانی سمجھا جاتا تھا۔ سفارت کاری میں اس کا اہم ترین کارنامہ یہ شمار ہوتا تھا کہ ملکہ کیتھرائن نے اسے اپنے پرائیویٹ ڈریسنگ روم میں شرف باریابی بخشا اور فرمایا۔

"اگر میری عمر کچھ کم ہوتی' تو میں اس قدر مصلحت اندیشی اور اختیار سے ہرگز کام نہ لیتی۔" روس کی ملکہ کیتھرائن کی عمر پچاس برس سے اوپر تھی اور خوبصورت مرد اس کی کمزوری مشہور تھے۔

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ڈپلومیسی میں برطانیہ کا تجربہ دوسروں کی نسبت زیادہ طویل اور وسیع ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ انگریزوں نے سفارت کا ڈھونگ رچا کر مغل بادشاہوں سے ایسی مراعات حاصل کر لیں جن کو آڑ بنا کر رفتہ رفتہ وہ اس برصغیر کے حکمران بن بیٹھے لیکن یہ سفارت کاری کا عمل کم اور تجارت کے پردے میں سیاسی سازشوں اور فوجی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ زیادہ تھا۔ لارڈ پامرسٹن (متوفی ۱۸۶۵ء) کے زمانے تک سارے دنیا میں انگلستان کے صرف تین سفیر سینٹ پیٹرز برگ' پیرس اور ویانا میں متعین تھے۔ باقی مقامات پر فقط ایک آدھ کونسلر اور دو تین کلرک کافی سمجھے جاتے تھے۔ لارڈ پامرسٹن خود بھی لندن کی وزارت خارجہ میں ہفتہ میں دو یا تین روز سے زیادہ آ کر بیٹھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ فارن آفس کا مٹھی بھر عملہ اپنا زیادہ وقت شغل بیکاری میں گزارتا

For more books visit www.4Urdu.com

تھا۔ وقت کاٹنے کے لیے ان کا ایک محبوب مشغلہ یہ تھا کہ شیشوں کا گھما پھرا کر وہ سڑک کے دوسری جانب نمبر ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ میں پرائم منسٹر کے ہاں کام کرنے والی خادماؤں پر روشنی کی تیز تیز شعاعیں ڈالا کرتے تھے۔

URDU4U.COM

ٹیلیگرافی' ٹیلیفون' ریڈیو' ٹیلیویژن' ہوائی جہاز اور موجودہ ایٹمی دور کی "ہاٹ لائن" سیٹلائٹ اور دیگر برق رفتار ذرائع رسل و رسائل کی ایجادات نے سفارت کاری کی اہمیت اور نوعیت کو یکسر بدل ڈالا ہے۔ ایک زمانے میں امریکہ کے صدر لنکن کی موت کی خبر ہندوستان میں تین ماہ بعد پہنچی تھی۔ صدر کینیڈی کے قتل کی خبر ساری دنیا میں چند منٹ کے اندر پھیل گئی۔ آج کل مملکتوں اور حکومتوں کے سربراہ ایک دوسرے کے ساتھ فوری طور پر مل کر یا "ہاٹ لائن" پر گفتگو کر کے بڑے بڑے نازک مسائل پر قابو پا لیتے ہیں۔ موجودہ دور میں سفارت کاری کا سب سے بڑا کمال غالباً یہی ہے کہ وہ حکمرانوں کے درمیان افہام و تفہیم اور باہمی میل ملاپ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھیں۔

آج کل بیشتر ممالک میں سفارتی عہدوں فارن سروس کے پیشہ ور افراد سے پر کئے جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی سیاست کے علاوہ دوسرے شعبوں سے بھی بعض لوگوں کو بوجوہ منتخب کر کے ان عہدوں سے نواز دیا جاتا ہے۔ البتہ امریکہ واحد ملک ہے جہاں ایک انجینئر تاجر' سیاستدان' صنعت کار' بینکر' انشورنس ایجنٹ' وکیل یا یونیورسٹی کا پروفیسر بھی آسانی سے سفیر کا عہدہ حاصل کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ کروڑ پتی ہو اور جیتے ہوئے صدر کی انتخابی مہم میں جی کھول کر چندہ دے چکا ہو۔ ایک بہت بڑے تاجر میکسویل گلک کے متعلق مشہور ہے کہ ۱۹۵۷ء میں اس نے ۲۱۵۰۰ ڈالر کا چندہ ادا کر کے سری لنکا میں سفیر کا عہدہ حاصل کیا تھا۔ جب وہ سینیٹ کی فارن ریلیشنز کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے' تو ان سے پوچھا گیا کہ سری لنکا میں کیا مسائل ہیں جن کے ساتھ امریکن سفیر کا واسطہ پڑے گا؟ اس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔

پھر پوچھا گیا۔ "ہندوستان کے وزیراعظم کا نام کیا ہے؟"

For more books visit www.4Urdu.com

مسٹر گلک نے جواب دیا۔ "مجھے نام یاد نہیں آ رہا۔"
پھر پوچھا گیا۔ "سری لنکا کا وزیراعظم کون ہے؟"
مسٹر گلک نے جواب دیا۔ "اس کا کچھ عجیب اور نامانوس سا نام ہے' مجھے یاد نہیں۔"
سری لنکا میں سفیر کے طور پر مسٹر گلک کی تقرری منظور ہو گئی۔ وزیراعظم مسٹر بندرانائیکے تک جب یہ خبر پہنچی کہ کولمبو آنے سے پہلے امریکی سفیر ان کا نام تک نہ بتا سکتے تھے' تو انہوں نے ہنس کر ٹال دیا اور کہا کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ وہ چار برس آکسفورڈ یونیورسٹی میں رہے اور صرف دو شخص ان کے نام کا صحیح تلفظ ادا کرنے میں کامیاب ہوئے۔
پاکستان کو بھی ایک ایسے امریکی سفیر سے واسطہ پڑ چکا ہے' جو امریکہ میں غالباً کوکا کولا کی تجارتی فرم کے وائس پریذیڈنٹ تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے یہ عہدۂ جلیلہ کس قدر چندہ کے عوض حاصل کیا تھا۔
پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے ہالینڈ جانے کے لیے میں نے عفت اور ثاقب کے ساتھ کراچی سے نیپلز تک سمندری جہاز سے سفر کیا اور چند روز روم میں ٹھہرنے کے بعد ریل کے ذریعہ ہم پہلے ایمسٹرڈیم اور پھر دی ہیگ پہنچے۔ ہیگ میں ہماری رہائش گاہ ایک تاریخی چوک پلین ۱۸۱۳ میں تھی۔ اس چوک کے چاروں کونوں میں صرف ایک ایک عمارت تھی۔ ایک کونے میں ہماری دو منزلہ رہائش گاہ تھی جس کے سامنے خوبصورت باغ اور پیچھے نہایت وسیع لان تھا۔ یہ عمارت حکومت پاکستان کی اپنی خرید کردہ ملکیت ہے۔ اس کے سامنے والے کونے میں وزیر خارجہ کی سرکاری قیام گاہ ہے۔ تیسرے کونے میں وزیراعظم کا دفتر اور اس کے سامنے کینیڈا کا سفارت خانہ ہے۔ یہ چوک قومی آثار قدیمہ میں شمار ہوتا ہے اور ان پر چار عمارات کے علاوہ یہاں پر کوئی اور مکان یا دکان تعمیر کرنے کی اجازت نہیں۔
ہالینڈ کا دارالسلطنت تو ایمسٹرڈیم کہلاتا ہے۔ لیکن حکومت کے دفاتر ہیگ میں ہیں۔ اور

For more books visit www.4Urdu.com

ملکہ کا محل ہیگ سے ۳۰ کلومیٹر دور واقع ہے۔ جب میری باری آئی کہ میں ملکہ جولیانا کے سامنے حاضر ہو کر ان کی خدمت میں اپنی سفارتی اسناد پیش کروں تو شدید برفباری کے دن تھے۔ صبح آٹھ بجے شاہی محل کی ایک خوبصورت کار اور موٹر سائیکل سوار پولیس کے آٹھ جوان ہمارے ہاں آ گئے۔ ساڑھے آٹھ بجے میں اس کار پر پاکستان کا سبز پرچم لہراتا ہوا شاہی محل کے لیے روانہ ہو گیا۔ موٹر سائیکل سوار پولیس نے کار کو اپنے حصار میں لے لیا۔ چار آگے چار پیچھے۔ پولیس کے دستے کا سائرن سنتے ہی سڑک کا سارا ٹریفک ہمارے قافلہ کو راستہ دے دیتا تھا۔ کوئی چالیس پینتالیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد جب ہم شاہی محل کی حدود میں داخل ہوئے تو صدر دروازے پر ایک چست اور مستعد فوجی گارد نے سلامی دی۔ اندر شاہی دربار کا ایک مارشل مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گیا۔ وہاں پر ہم کچھ دیر کافی پیتے اور خوش گپیاں کرتے رہے۔ اتنے میں وزات خارجہ کا چیف آف پروٹوکول اندر آیا اور مجھے اپنے ساتھ ملکہ جولیانا کی خدمت میں لے گیا۔ اسناد سفارت پیش کرنے کے بعد ہم دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ ملکہ جولیانا کچھ دیر پاکستان کے بارے میں خیر سگالی کی باتیں کرتی رہیں۔ انہوں نے بیگم لیاقت علی خاں کا بھی خاص احترام سے ذکر کیا جو مجھ سے پہلے ہالینڈ میں پاکستان کی سفیر رہ چکی تھیں۔ پھر پروٹوکول کا عملہ ہمارے سفارت خانہ کے ایک افسر مسٹر جمیل الحسن کو اندر لے آیا۔ میں نے ان کا تعارف ملکہ سے کرایا اور اس کے بعد ہم اسی طرح موٹر سائیکل سوار پولیس کے ہمراہ ایک جلوس کی صورت میں واپس ہیگ آ گئے۔

ہالینڈ کے ساتھ ہمارے تعلقات میں کوئی الجھاؤ نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں وہاں پر پاکستانیوں کی تعداد بھی نہایت کم تھی۔ اس وقت تک ان کے بھی کوئی خاص مسائل پیدا نہ ہوئے تھے۔ اس لیے سفارت خانے میں میرا کام غیر معمولی حد تک آسان اور ہلکا تھا۔ میرے ساتھ کام کرنے والا سارا عملہ بھی محنتی اور دیانتدار تھا۔ اپنے فالتو وقت کو مصرف میں لانے کے لیے میں نے لائڈن یونیورسٹی کی ایسٹرن انسٹی ٹیوٹ سے کسی قدر استفادہ کیا۔ صوفی مشرف خان اور ان کی ولندیزی بیگم سے راہ و رسم بڑھی' تو

For more books visit www.4Urdu.com

صوفی عنایت خان کے حوالے سے میں نے یورپ میں صوفی تحریک کا تھوڑا بہت جائزہ لیا۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کی انسٹی ٹیوٹ آف پیراسائیکالوجی کے ڈائریکٹر پروفیسر ٹین ہاف کے ساتھ بھی میرے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ ان کی اجازت سے میں نے کچھ عرصہ پیراسائیکالوجی کی ایک پوسٹ گریجوایٹ کلاس میں شرکت بھی کی۔ وہاں پر لیکچر دینے دنیا بھر کے ماہر روحانیات' نفسیات اور مابعد النفسیات کے عالم اور علاج بالاعتقاد کرنے والے نامی گرامی ڈاکٹر آیا کرتے تھے۔ ان میں مسٹر جیرڈ کرانسیٹ کی بین الاقوامی شخصیت کا خاص درجہ تھا۔ قومیت کے لحاظ سے تو وہ ولندیزی تھے لیکن سارے یورپ اور امریکہ میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ علاج بالاعتقاد Faith Healing کے علاوہ ان کے فن میں کشفیات کو خاص دخل تھا۔ خصوصاً وہ گمشدہ بچوں اور لاپتہ عورتوں اور مردوں کی نشاندہی کرنے میں عجیب مہارت دکھاتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی زندہ بچے' عورت یا مرد کا سراغ لگانے میں وہ کبھی کامیاب نہ ہوئے۔ ان کا کشف جب کبھی بروئے کار آیا فقط لاشوں کا کھوج لگانے کے کام آیا۔ ان تمام حضرات کے عملی کمالات اور پیراسائیکالوجی کے علمی نصاب کا بغور تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مغرب کا یہ سارا کاروبار اسلامی تصوف کی ابجد تک کو نہیں چھوتا۔

انسٹی ٹیوٹ آف پیراسائیکالوجی کے سربراہ ٹین ہاف اکثر مہینے میں ایک ویک اینڈ ہمارے ہاں گزارا کرتے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی تصانیف ضیاء القلوب کا انگریزی ترجمہ کر کے میں نے انہیں دیا تو وہ ششدر رہ گئے۔ ان کا جی تو بہت للچایا کہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائیں' لیکن اپنی ملازمت کے تحفظ کی فکر اور معاشرے کے خوف سے اس سعادت سے محروم رہے۔ البتہ ان کی اسٹینوگرافر مس جین ڈالٹن پر بیٹھے بٹھائے اللہ کا فضل ہو گیا۔ اپنے ادارے میں واپس جا کر پروفیسر صاحب نے ضیاء القلوب کا انگریزی ترجمہ اپنی اسٹینو گرافر کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے ان کے کاغذات کے ساتھ سنبھال کر رکھ دے۔ مسٹر ڈالٹن تجسس کا

For more books visit www.4Urdu.com

شوق رکھنے والی تحقیق پسند لڑکی تھی۔ اس نے ضیاء القلوب کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر ایسا اثر قبول کیا کہ ایک روز ہمارے ہاں آئی اور درخواست کی کہ ہم اسے مسلمان کر لیں۔

URDU4U.COM

میں نے کہا کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر بتائے کہ وہ کیوں مسلمان ہونا چاہتی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ اس راہ سلوک پر چلنے کی آرزو مند ہے جسے اختیار کرنے کا طریقہ ضیاء القلوب میں بتایا گیا ہے۔

ہم نے نہایت خاموشی سے اسے مشرف بہ اسلام کر کے اس کا نام رابعہ رکھ دیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک وہ ہمارے ہاں رہی۔ عفت نے اسے قرآن شریف ختم کروایا۔ پھر وہ ملازمت چھوڑ کر اپنے گاؤں چلی گئی اور عبادت اور ریاضت کے سہارے راہ سلوک پر ایسا قدم رکھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہم جیسے گنہگاروں کی پہنچ سے بہت دور نکل گئی۔ اس نے ساری عمر شادی نہیں کی اور اب کچھ عرصہ سے اس کا مستقل قیام مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں ہے۔

دنیا کے دوسرے بہت سے دارالخلافوں کی طرح ہیگ میں بھی مقامی لوگوں کا ایک ایسا گروہ موجود تھا۔ جو سفارت خانوں کے استقبالیوں میں بن بلائے مہمانوں کی حیثیت سے شریک ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ قریباً قریباً ہر سفارت خانے کی ریسپشنز میں یہ جانے پہچانے "مان نہ مان میں تیرا مہمان" نظر آیا کرتے تھے۔ خوش لباسی اور خوش گفتاری ان کا خاص طرۂ امتیاز تھا اور موقع محل کے لحاظ سے وہ ہلکی پھلکی گپ شپ اور مقامی سکینڈل سنانے میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ہالینڈ کی وزارت خارجہ کے افسر ان لوگوں کی طرف نہایت قہر آلود نگاہوں سے گھورا کرتے تھے' کیونکہ ان کے خیال میں غیر ملکی تقریبات میں گیٹ کریش Gate Crash کر کے یہ افراد ڈچ قوم کا وقار گرا رہے تھے' لیکن عام طور پر سفارت خانے ان سے قطع تعلق کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ البتہ کمیونسٹ ممالک کی تقاریب میں شامل ہونے سے یہ لوگ بھی احتیاط برتتے تھے۔

For more books visit www.4Urdu.com

اپنے اپنے وطن کا قومی دن ہر سفارت خانے کے لیے خاص اہمیت اور جشن کا دن Day Red Letter ہوتا ہے۔ اس دن کو منانے کے لیے عام طور پر ایک شاندار استقبالیہ منعقد کیا جاتا ہے' جس میں اکثریت ایسے مدعوئی کی ہوتی ہے جو یوں بھی وقتہ فوقتہ ایک دوسرے کے ساتھ ملتے جلتے ہی رہتے ہیں۔ بھیڑ بھاڑ' ناؤ نوش' خوش خوری اور سبک گفتاری کے انبوہ کے درمیان یہ استقبالیے بعض اوقات ماہی منڈی کا سا سماں پیش کرتے ہیں۔ جہاں پر ایک دوسرے کے ساتھ سنجیدہ گفت و شنید کا امکان سراسر مفقود ہوتا ہے۔ ایسے ہجوم میں خاموش رہ کر صرف کھانے پینے سے دلچسپی لینا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے ہر کوئی ایک غیر معین سی خیر سگالی کی آڑ لے کر ایسی ایسی سمال ٹاک (Small Talk) کرنے میں لگا ہوتا ہے جن کی مثال اور کسی جگہ ملنا محال ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص خوب سے خوب تر کی تلاش میں اس قدر سرگرداں ہوتا ہے کہ گفتگو کے دوران اگر اپنے مخاطب سے زیادہ کوئی اہم شخصیت نزدیک نظر آ جائے تو منہ کی بات ادھوری چھوڑ کر آناً فاناً اس کی طرف رجوع کرنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھا جاتا۔ دنیا بھر کے بہت سے ممالک میں اس طرح کی بے شمار تقاریب میں شریک ہونے کے بعد میرا اندازہ ہے کہ ان استقبالیوں میں کوئی مقصد پورا نہیں ہوتا اور تھوڑی سی وقتی نمائش کو چھوڑ کر ان کا حاصل فقط وقت اور وسائل کا ضیاع ہے۔ ایک بار میں نے وزیر خارجہ مسٹر بھٹو کو ہالینڈ سے یہ تجویز لکھ کر بھیجی تھی کہ ہمارے سفارت خانے اس قسم کے رسمی استقبالیوں پر جو لاکھوں زر مبادلہ ہر سال خرچ کرتے ہیں' اس کا زیادہ بہتر مصرف یہ ہو گا کہ اس رقم سے دوائیاں خرید کر اپنے وطن کے غریب بیماروں میں مفت بانٹ دی جائیں۔ اس خط کا تو مجھے کوئی جواب نہ ملا لیکن مجھے امید ہے کہ ایک نہ ایک روز کوئی نہ کوئی حقیقت شناس ملک جرات سے کام لے کر اس بے معنی بے مقصد اور مسرفانہ رسم سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

ہالینڈ پہنچ کر محکمہ پروٹوکول کے ایک افسر نے مجھے بر سبیل تذکرہ یہ بتایا کہ اگر ہم سور کے گوشت (پورک ہیم' بیکن وغیرہ) سے پرہیز کرتے ہیں تو بازار سے بنا بنایا قیمہ نہ

For more books visit www.4Urdu.com

خریدیں کیونکہ بنے ہوئے قیمے میں اکثر ہر قسم کا ملا جلا گوشت شامل ہوتا ہے۔ اس انتباہ کے بعد ہم لوگ ہالینڈ کے استقبالیوں کا ایک من بھاتا کھاجا قیمے کی گولیاں (Balls Meat) کھانے سے اجتناب کرتے تھے۔

URDU4U.COM

ایک روز قصر امن میں بین الاقوامی عدالت عالیہ کا سالانہ استقبالیہ تھا۔ چودھری ظفر اللہ خان بھی اس عدالت کے جج تھے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ قیمے کی گولیاں سر کے اور رائی کی چٹنی میں ڈبو ڈبو کر مزے سے نوش فرما رہے ہیں۔ میں نے عفت سے کہا کہ آج تو چودھری صاحب ہمارے میزبان ہیں' اس لیے قیمہ بھی ٹھیک ہی منگوایا ہو گا۔ وہ بولی' ذرا ٹھہرو پہلے پوچھ لینا چاہیے۔

ہم دونوں چودھری صاحب کے پاس گئے۔ سلام کر کے عفت نے پوچھا۔ "چودھری صاحب! یہ تو آپ کی ریسپشن ہے۔ قیمہ تو ضرور آپ کی ہدایت کے مطابق منگوایا گیا ہو گا؟"

چودھری صاحب نے جواب دیا۔ "ریسپشن کی انتظامیہ کا محکمہ الگ ہے۔ قیمہ اچھا ہی لائے ہوں گے۔ لو یہ کباب چکھ کر دیکھو۔"

عفت نے ہر قسم کے ملے جلے گوشت کا خدشہ بیان کیا۔ تو چودھری صاحب بولے۔

"بعض موقعوں پر بہت زیادہ کرید میں نہیں پڑنا چاہیے۔ حضور کا فرمان بھی یہی ہے۔"

دین کے معاملات میں عفت بے حد منہ پھٹ عورت تھی۔ اس نے نہایت تیکھے پن سے کہا۔ "یہ فرمان آپ کے حضور کا ہے یا ہمارے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا؟"

ہیگ میں ہمارے قیام کے دوران چودھری صاحب کا معمول تھا کہ اتوار کے روز شام کے چار بجے ہم کار بھیج کر انہیں اپنے ہاں لے آتے تھے۔ رات کا کھانا کھلا کر نو بجے کے قریب ہم انہیں ان کے فلیٹ میں واپس پہنچا آتے تھے۔ ان کی یادداشت غضب کی تیز تھی اور ان کی زندگی کے مختلف ادوار کے متعلق ان کی گفتگو نہایت دلچسپ ہوتی تھی۔ ایک دو گھنٹے وہ ہمارے ساتھ انتہائی انہماک سے Scrabble بھی کھیلا کرتے تھے۔ انگریزی زبان پر اس قدر عبور حاصل ہونے کے باوجود وہ دوسروں کے حروف پر

For more books visit www.4Urdu.com

کن انکھیوں سے نظر ڈالنے سے دریغ نہ کرتے تھے' اور ان چھوٹی چھوٹی چالاکیوں سے بازی جیت کر وہ بچوں کی طرح خوش ہوا کرتے تھے۔

جس روز وہ پہلی بار ہمارے ہاں آئے' ثاقب انہیں دیکھ کر بے حد حیران ہوا اس کی عمر اس وقت دو برس کی تھی۔ چند روز قبل ہم اسے ہالینڈ کے سب سے بڑے چڑیا گھر کی سیر کروا کر لائے تھے۔ چودھری ظفر اللہ خاں کے سرخ و سفید چہرے پر سفید داڑھی اور سر پر سرخ رومی ٹوپی دیکھ کر وہ زور سے بولا۔ "کیا یہ ببر شیر ہے؟"

چودھری صاحب طبعہ چھوٹے بچوں میں بالکل کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ اس لیے ہر اتوار کو جب وہ چار پانچ گھنٹے ہمارے ہاں گزارتے تھے' تو اتنا عرصہ ثاقب قدرتی طور پر نظر انداز رہتا تھا۔ یہ بات اس پر اتنی شاق گزرتی تھی کہ وہ دل ہی دل میں ان کے خلاف شدید دشمنی کے جذبات پالتا رہتا تھا۔ ان جذبات کا اظہار کرنے کے لیے وہ دو موقعوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ ایک تو یہ کہ چودھری صاحب کے ارد گرد منڈلا کر وہ زیر لب بڑبڑایا کرتا تھا۔ "توڑ کر پکا کر کھا جاؤں گا۔" عفت نے ثاقب کو بہت ڈانٹا ڈپٹا' ڈرایا دھمکایا کہ وہ معزز مہمان کے قریب جا کر ایسی بدتمیزی کی باتیں نہ کرے' لیکن وہ کبھی باز نہ آیا۔ البتہ غنیمت یہ ہوئی کہ چودھری صاحب اس کا یہ فقرہ کبھی سمجھ ہی نہ پائے۔ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے چودھری صاحب دودھ کے ایک گلاس میں شہد کے دو چمچے ملا کر پیا کرتے تھے جونہی ان کے لیے دودھ کا گلاس لایا جاتا' ثاقب بھی ضرور کہیں نہ کہیں سے آ کر عین سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی وہ شہد کا دوسرا چمچہ دودھ میں ڈالنے لگتے تھے' ثاقب چلا کر کہتا تھا۔ "بس بس ختم ہو جائے گا۔" ہم نے اس کو اس حرکت سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی' لیکن بے سود۔

ہیگ میں محمود ربانی نام کا ایک لبنانی نوجوان بھی رہائش پذیر تھا۔ اس کا بہت بڑا اور وسیع کاروبار تھا اور وہ نہایت امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ چودھری ظفر اللہ خاں کی دوسری بیگم بشریٰ کا بھائی تھا۔ کچھ عرصہ قبل چودھری صاحب اور بشریٰ بیگم

For more books visit www.4Urdu.com

کے درمیان علیحدگی ہو چکی تھی۔ کسی وجہ سے محمود ربانی چودھری صاحب کا مداح نہ تھا۔ بلکہ ان کے خلاف معاندانہ اور سوقیانہ گفتگو کرنے کے موقع کی تلاش میں رہا کرتا تھا۔

URDU4U.COM

وہ کئی بار میرے پاس آیا اور چودھری صاحب کی ذات کو الف لیلوی انداز سے بے نقاب کرنے کی پیش کش کی' لیکن میں اسے خوش اسلوبی سے ٹالتا رہا' البتہ ہیگ میں ایسے افراد کی کمی نہ تھی جو محمود ربانی کو ہاتھوں ہاتھ لے کر سر ظفر اللہ خاں جیسی بین الاقوامی شہرت کے مالک اور عالمی عدالت کے جج کی کردار کشی کی داستانوں کو چٹخارے لے لے کر سننے کے شوقین نہ ہوں۔

ہیگ میں جتنے سفیر متعین تھے۔ ان میں ایک خاص کندۂ ناتراش بھارتی سفیر تھا۔ وہ کسی چھوٹی موٹی ریاست کا راجکمار تھا اور ضرورت سے زیادہ بلند آواز میں باتیں کرنے کا عادی تھا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں جب یہ غلط خبر پھیلی کہ ہندوستانی افواج نے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے تو اچانک سفارتی حلقوں میں یہ افواہ گشت کرنے لگی کہ بعض نجی محفلوں میں بھارتی سفیر یہ ڈینگیں مار رہا ہے کہ وہ عنقریب پلین ۱۸۱۳ میں پاکستانی سفارت خانے کی عمارت پر قبضہ کر کے اس میں ہندوستانی آرٹ اور کلچر کا مرکز کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس قسم کی خبریں سن کر ترکی کے سفیر خاص طور پر مجھے ملنے آئے۔

میں نے ان سے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ جو باتیں ہندوستانی سفیر سے منسوب کی جا رہی ہیں' وہ محض بے بنیاد افواہیں ہیں۔"

ترکی کے سفیر نے مسکرا کر پوچھا۔ "آپ کی اس خوش فہمی کی کیا خاص وجہ ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں کوئی ذمہ دار سفیر بقائمی ہوش و حواس اس قسم کی بیہودہ باتیں نہیں کر سکتا۔"

ترکی کے سفیر استنبول یونیورسٹی کے پروفیسر رہ چکے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "ہندوستان کی اسٹیٹ پالیسی کی بنیاد کوٹلیہ یا چانکیہ کے فلسفہ پر ہے۔ ان کی سیاسی اور سفارتی بائبل "ارتھ شاستر" ہے۔ غالباً ارتھ شاستر کی رو سے ایسی باتیں کرنا بالکل ممنوع نہیں جو آج

For more books visit www.4Urdu.com

کل یہاں پر ہندوستانی سفیر کے ساتھ منسوب ہو رہی ہیں۔ سنا ہے کہ نئی دہلی میں سفارت خانوں کے علاقوں کو چانکیہ پوری" کہا جاتا ہے۔"

URDU4U.COM

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران پرتگال کا سفیر مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر بار بار ملا کرتا تھا اور زور زور سے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تیز تیز لہجے میں کہا کرتا تھا۔ "ان کو مارو۔ ایسا مارو کہ ان کا سر کچل ڈالو۔"

پرتگال کا سفیر دل سے خواہشمند تھا کہ اس جنگ میں ہندوستان کو شکست فاش نصیب ہو۔ اس کی خفگی کی وجہ یہ تھی کہ کشمیر' جونا گڑھ اور حیدر آباد کی طرح بھارت نے گوآ پر بھی زبردستی قبضہ کر رکھا تھا۔

ایران کے سفیر ایک کمزور شخصیت کے مالک تھے' ان کی سب سے بڑی مضبوطی صرف یہ تھی کہ شہنشاہ رضا پہلوی کے خاندان کے ساتھ ان کا کسی قسم کا رشتہ تھا۔ وہ اس رشتے کے زعم کی کلغی ہر وقت سر پر سجائے رکھتے تھے۔ شراب کے رسیا تھے لیکن بہت جلد انٹا غفیل ہو کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جایا کرتے تھے۔ تھوڑی سی مے نوشی کے بعد وہ بھری محفل میں لکڑی کا کندہ بن کر ایستادہ ہو جاتے تھے اور دیر دیر تک زمین جنبد نہ جنبد گل محمد کی مثال بے حس و حرکت کھڑے رہتے تھے۔

امریکی سفیر پہلے تو میرے ساتھ کچھ کھنچے کھنچے سے رہے لیکن ایک چھوٹے سے واقعہ کے بعد ہمارے درمیان جمی ہوئی سرد مہری کی برف پگھل گئی۔ ایک اتوار کے روز دوپہر کے بارہ بجے کے قریب میں' عفت اور ثاقب سڑک کے کنارے کھڑے ساحل سمندر کی طرف جانے والی ٹرام کا انتظار کر رہے تھے۔ امریکی سفیر اپنی بیوی کے ساتھ کار میں ادھر سے گزرا۔ ہمیں دیکھ کر وہ رک گئے اور پوچھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ میں نے بتایا کہ ہم ساحل سمندر کی طرف جانے والی ٹرام نمبر۸ کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بولے کہ وہ بھی وہیں جا رہے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ کار میں بیٹھ جائیں۔ میں نے کہا۔ "ہم بیچ پر پکنک منانے ہمیشہ ٹرام ہی سے جاتے ہیں۔ اگر ہم کار

For more books visit www.4Urdu.com

سے جائیں تو ہمارا بیٹا برا مناتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا ہمارے پاس ٹرام میں سفر کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں؟"

URDU4U.COM

یہ سن کر سفیر کی بیوی مسز ٹیلر خوب ہنسی اور بولی۔ "اچھا' آپ اپنے بچے کی خوشی کی خاطر آئیں تو بے شک ٹرام سے' لیکن وہاں پر یوروپا ہوٹل میں آ کر ہمارے ساتھ لنچ ضرور کریں۔"

عفت نے کہا۔ "مسز ٹیلر' اگر وہاں پر بھی آپ نے ہوٹل کے اندر بیٹھ کر لنچ کھانا ہے' تو بیچ پر جانے کا فائدہ؟ ------- میری تجویز ہے کہ آپ اپنی کار چھوڑ دیں اور ہمارے ساتھ مل کر ٹرام میں چلیں۔ آپ کو واقعی پکنک کا لطف آئے گا۔"

معلوم نہیں' انہیں یہ بات اچھی لگی یا بری' لیکن اخلاقاً اور مروتاً انہوں نے اپنی موٹر کار واپس بھیج دی اور ہمارے ساتھ ٹرام میں بیٹھ کر سخیونینگن کی طرف روانہ ہو گئے۔ بیچ پر پہنچ کر ہم نے کہیں سے مونگ پھلی خریدی۔ کہیں سے مکئی کی میٹھی اور نمکین کھیلیں' کچھ آئس کریم کے ڈبے' چند کوکا کولا کی بوتلیں اور اپنے ساتھ لائے ہوئے آلو کے بھرے ہوئے پراٹھے' مٹر قیمہ اور گھر کا بنا ہوا آم کا اچار ان کی خدمت میں پیش کیا۔ خشک ریت پر بیٹھ کر انہوں نے یہ کھانا ایسی رغبت سے کھایا کہ اس کے بعد وہ اور بھی کئی بار اسی طرح ہمارے ساتھ ٹرام میں بیچ پر آئے۔ ہماری دیکھا دیکھی کئی اور سفیر بھی گرمیوں کے موسم میں اتوار کے اتوار اسی طرح بے تکلفی سے بیچ پر اکٹھے مل کر پکنک منانے لگے۔ البتہ برطانوی سفیر نے اپنی اکڑفوں بدستور قائم رکھی۔ وہ ہمیشہ اپنی شاندار رولز رائس میں آتا تھا اور تھری پیس سوٹ اور فیلٹ ہیٹ میں ملبوس ریتلے گرد و غبار سے دامن بچاتا۔ پکی سڑک پر کچھ دیر سمندری ہوا کھا کر داد عیش دے جاتا تھا۔

ہیگ میں چینی سفارت خانہ ایک ناظم الامور کے چارج میں تھا۔ اس کے ساتھ ہمارے نہایت اچھے تعلقات تھے اور ہم ایک دوسرے کو اکثر کھانے یا چائے کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ ناظم الامور عوامی جمہوریہ چین کی جدوجہد آزادی کا ایک پرانا اور آزمودہ کار سپاہی

For more books visit www.4Urdu.com

تھا۔ ایک بار چند چینی ماہرین کا کوئی وفد ہیگ آیا ہوا تھا۔ وہ سب چینی سفارت خانے کی بالائی منزل میں قیام پذیر تھے۔ کسی طرح مقامی خفیہ اداروں نے وفد کے ایک رکن کو ورغلا کر چین سے منحرف ہونے اور ہالینڈ میں سیاسی پناہ حاصل کرنے پر آمادہ کر لیا۔ غالباً چینی ناظم الامور اس شخص کی نیت کو بھانپ گیا اور اسے سفارت خانے سے باہر نکلنے سے منع کر دیا۔ پھر ایک روز ایک خاص وقت پر اس شخص نے سفارت خانے کی بالائی منزل کی کھڑکی سے باہر سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ پکی سڑک پر گر کر وہ کافی زخمی ہو گیا۔ عین اس وقت ایک ایمبولینس جو کہیں پاس ہی منتظر کھڑا تھا' عیب سے نمودار ہوا اور زخمی چینی کو اس میں ڈال کر ہسپتال روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز چینی ناظم الامور اور اس کے چند ساتھیوں نے آپریشن تھیٹر میں کام کرنے والے ڈاکٹروں اور نرسوں کی وردی پہنی۔ چہرے پر جراثیم روکنے والی جالیاں اور ماسک چڑھائے اور حلیہ بدل کر ہسپتال پہنچ گئے۔ زخمی چینی کو آپریشن تھیٹر لے جانے کے بہانے انہوں نے اسے ایک اسٹریچر پر لٹایا اور اپنی کار میں ڈال کر چینی سفارت خانے لے آئے۔ جب ہسپتال والوں کو حقیقت حال کا علم ہوا تو ڈچ پولیس نے فوراً سفارت خانے کا محاصرہ کر لیا۔ حکومت زخمی چینی کو اپنے قبضہ میں لے کر دوبارہ ہسپتال لے جانا چاہتی تھی' لیکن ہر سفارت خانے کی چار دیواری مقامی قانون کی دسترس سے باہر ہوتی ہے اور اجازت کے بغیر کوئی شخص کسی سفارت خانے میں داخل ہونے کا مجاز نہیں ہوتا۔ پولیس کا محاصرہ دس روز تک جاری رہا اور وہ زخمی چینی سفارت خانے کے اندر ہی پڑا پڑا دم توڑ گیا۔ اس پر ناراض ہو کر ڈچ حکومت نے چینی ناظم الامور کو ناپسندیدہ شخص قرار دے کر چوبیس گھنٹے میں ہالینڈ سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ ہیگ چھوڑنے سے پہلے وہ چند منٹ کے لیے مجھے بھی الوداع کہنے آیا۔ اس روا روی کے عالم میں بھی اس نے پاکستان کے ساتھ اپنی خیر سگالی کا خوب ثبوت دیا۔

میرے قیام ہالینڈ کے دوران ہم نے "اقبال ڈے" منانے کا اہتمام ہر برس لائڈن یونیورسٹی

For more books visit www.4Urdu.com

میں کیا۔ ایک بار وہاں کے وزیر تعلیم اقبال ڈے کی صدارت کے لیے آئے' تو ان کے ہمراہ ان کے ایک دوست بھی تھے جنہیں میں پہچانتا تھا۔ کئی برس پیشتر ہم دونوں ایک ٹریننگ کورس میں اکٹھے رہ چکے تھے اور اس وقت سے ہمارے درمیان نہایت اچھے تعلقات استوار تھے۔ اب یہ صاب ایک عالمی سطح کے خفیہ ادارے میں کسی اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ اقبال ڈے پر اس تجدید ملاقات کے بعد وہ اکثر ہمارے ہاں آنے جانے لگے۔ کسی وجہ سے وہ یہودیوں سے سخت نفرت کرتے تھے اور کٹر عیسائی ہونے کے باوجود مسلمانوں کے لیے ان کے دل میں کسی قدر نرم گوشہ تھا۔ انہوں نے براہ راست تو مجھے کبھی کوئی راز کی بات نہ بتائی۔ لیکن ان کی باتوں کے بین السطور میں نے بہت سے دلچسپ نتائج اخذ کئے۔ خاص طور پر انڈونیشیا کے صدر سائیکارنو کے خلاف دونوں سپر پاورز کی سازشوں کی تفصیلات اور چند برس بعد پاکستان میں صدر ایوب کے نام ایک ٹاپ سیکرٹ خط میں لکھ دیں۔ انہوں نے اس خط کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا' اور اسے پڑھ کر داخل دفتر کر دیا۔ ممکن ہے کہ انہوں نے میرے خط کے اس حصہ کا برا بھی منایا ہو گا جس میں ان کے خلاف اٹھنے والے طوفان کے امکان کے متعلق کچھ اشارے کئے گئے تھے' لیکن فروری ۱۹۶۹ء میں اقتدار چھوڑنے سے ایک ماہ قبل انہوں نے مجھے کہا' آج میں نے تمہارا ہیگ والا خط فائل سے نکلوا کر دوبارہ پڑھا ہے۔ تم نے جو کچھ لکھا تھا' بڑی حد تک ٹھیک لکھا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟"

ہیگ میں عید کی نماز کی جماعت ہماری رہائش گاہ میں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر محمود جو آج کل کینیڈا میں پروفیسر ہیں' امامت کرایا کرتے تھے۔ وہ اس زمانے میں داخیننگن یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ اس موقع پر بہت سے پاکستانیوں کا اجتماع ہو جاتا تھا۔ ایک عید پر ایک نووارد ہنس مکھ نوجوان سے میں نے پوچھا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے؟

"میں کمرشل آرٹ سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"میں نے سنا ہے کہ کمرشل آرٹ سکول بہت بھاری فیسیں لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

For more books visit www.4Urdu.com

"جی ہاں' فیسیں تو بھاری ہیں۔" وہ بولا۔ "لیکن اللہ اس ملک کے کتوں کو سلامت رکھے' گزارا ہو رہا ہے۔"

اس عجیب پر جواب پر مجھے حیرت ہوئی تو اس نے یوں وضاحت کی۔ "یہاں پر ایک قانون ہے کہ اگر کوئی پالتو کتا کسی شخص کو کاٹ لے یا صرف پتلون پر دانت کے نشان لگ جائیں تو انشورنس کمپنی سے اسے کافی بھاری ہرجانہ مل سکتا ہے۔ دکانوں پر ایسا مسالہ بھی دستیاب ہے جو پتلون کے پائنچوں پر چھڑک پر باہر نکلا جائے تو کتے بے اختیار منہ کھول کر اس کی طرف لپکتے ہیں۔ کمرشل آرٹ کی فیس کی ادائیگی کے وقت میں ان سہولتوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتا رہتا ہوں۔"

مجھے اس نوجوان کی حاضر دماغی' سوجھ بوجھ اور خوش تدبیری پر واقعی رشک آیا۔ ساتھ ہی مجھے افسوس ہوا کہ تیرہ چودہ برس قبل جب میں اسی شہر کی انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اسٹڈیز میں ایک کورس کر رہا تھا' تو اس زمانے میں مجھے یہ گر کیوں نہ معلوم ہوا۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• سی ایس پی سے استعفیٰ

جنرل یحییٰ کے اقتدار میں آتے ہی حالات نے کچھ ایسا رنگ اختیار کیا کہ میں نے سول سروس آف پاکستان سے استعفیٰ دے دیا۔ عمر کے لحاظ سے اس وقت میری ملازمت کے ابھی آٹھ یا نو برس باقی تھے۔

URDU4U.COM

دراصل شروع ہی سے سول سروس میرے لیے بازیچہ اطفال کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ ملازمت کے دوران پہلے بھی میں نے چار بار استعفیٰ دے کر سول سروس کے بے رنگ و بو شیش محل سے نکل بھاگنے کی کوشش کی تھی' لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

پہلی بار جب مجھے استعفیٰ پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی' اس وقت مجھے آئی سی ایس میں داخل ہوئے فقط دس ماہ گزرے تھے۔ میں صوبہ بہار کے ضلع بھاگلپور میں اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر متعین تھا۔ درجہ سوم کی مجسٹریٹی کرنا اور پولیس کے تھانوں کی کارکردگی کا جائزہ لینا میرے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ میری کچہری میں جو مقدمات آتے تھے ان میں ملزموں کی اکثریت یکہ چلانے والوں' رکشا کھینچنے والوں' فٹ پاتھ پر چھابڑی لگانے والوں اور ممنوعہ علاقوں میں بر سر عام پیشاب کرنے والوں کی ہوا کرتی تھی۔ مجھے یہ لوگ بڑے مظلوم اور بے بس دکھائی دیتے تھے' جو چھوٹی چھوٹی بے ضابطگیوں کی پاداش میں زبردستی دھر لیے جاتے تھے۔ میں ایسے مقدموں کی سماعت پر زیادہ توجہ نہ دیتا تھا اور ضروری کارروائی پوری کر کے بعض ملزموں پر ہلکا سا جرمانہ کر دیتا تھا۔ بعض کو عدالت کے برخاست ہونے تک قید سنا دیتا تھا اور اکثریت کو باعزت بری کر دیتا تھا۔ اس پر میرا کمشنر اور سیشن جج دونوں بڑے ناخوش تھے اور وقتاً فوقتاً مجھے تحریری طور پر ڈانٹ پلاتے رہتے تھے۔ البتہ تھانوں کے معاینے کا فرض میں نے بڑی تندہی سے نبھایا۔ میں پروگرام بنائے بغیر کوئی دور افتادہ تھانہ چن کر وہاں اچانک یوں نازل ہو جایا کرتا

For more books visit www.4Urdu.com

تھا جیسے پولیس والے جوئے کے اڈوں پر چھاپہ مارا کرتے ہیں۔ دن دن' رات رات معائنہ کر کے میں تھانوں کی کارکردگی میں ہزاروں کیڑے نکال کر بڑی بڑی طویل رپورٹیں لکھا کرتا تھا۔ اس پر بھاگلپور کا انگریز ایس پی مجھ سے نالاں رہتا تھا۔

URDU4U.COM

انہی دنوں "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع ہوئی اور اس کی شدت نے آناً فاناً بھاگلپور کے پورے ضلع کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کانگرسیوں نے ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ دیں۔ سڑکوں کے پل توڑ دیئے' دریا کی کشتیاں جلا ڈالیں اور ڈاک خانوں' تار گھروں اور تھانوں پر حملے کر کے انہیں تباہ کر دیا۔ ضلع کے ساتھ سارے ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل منقطع ہو گئے اور جگہ جگہ دہشت انگیزی اور تشدد کے واقعات رونما ہونے لگے۔

ایک روز خبر آئی کہ کسی گاؤں میں کانگرسیوں نے ایک پولیس کانسٹیبل کو مار ڈالا ہے اور اس کی لاش کو یونین جیک میں لپیٹ کر ایک درخت سے لٹکا دیا ہے۔ کمشنر' کلکٹر' ڈی آئی جی اور ایس پی نے فوراً حکم لگایا کہ میں موقع واردات پر جاؤں اور تفتیش کے بعد ملزموں کو گرفتار کر کے بھاگلپور لاؤں۔

میں نے دفعدار شیر خاں کی سربراہی میں مسلح گھوڑ سوار پولیس کا ایک دستہ ساتھ لیا اور جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ Mounted Armed Polices پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں سے بھرتی کی جاتی تھی اور برٹش حکومت اسے ہندو اکثریت کے صوبوں میں نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے استعمال میں لاتی تھی۔ اس بندوبست میں آم کے آم گٹھلیوں کے دام تھے۔ ایک طرف تو امن بحال رہتا تھا' دوسری طرف ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف عموماً اور پنجابی اور پٹھان مسلمانوں کے خلاف خصوصاً منافرت کا جذبہ بڑی مضبوطی سے جڑ پکڑتا تھا۔

گاؤں پہنچ کر میں نے اپنا کیمپ لگایا اور مقامی کانگرسی لیڈروں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہاں کا ایک لیڈر بھارت کے سابق صدر بابو راجندر پرشاد کا بیٹا تھا۔ وہ اورینٹل لائف انشورنس کارپوریشن کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ اور چند ماہ پیشتر

For more books visit www.4Urdu.com

میں نے اس سے پانچ ہزار روپے کی انشورنس پالیسی لی تھی۔ میرے بلاوے پر وہ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ میرے کیمپ میں آ گیا۔ پہلے انہوں نے آزادی کی برکات پر جی بھر کے لمبی لمبی تقریریں کیں۔ میں بھی کالج سے تازہ تازہ نکلا ہوا تھا۔ جواباً میں نے بھی غلامی کی لعنت پر حسب توفیق تبصرہ کیا۔ میری باتیں سن کر وہ لوگ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ دفعدار شیر خاں نے چائے تیار کروائی۔ چائے کے دوران کانگرسی لیڈروں نے ازراہ خیر سگالی اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر آئی سی ایس میں میرے ہم خیال لوگ زیادہ تعداد میں ہوتے تو آج پولیس کے سپاہیوں کے قتل و خون کی نوبت ہی نہ آتی۔ میں نے عرض کیا کہ اگر میں پولیس کانسٹیبل کے قاتلوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہا۔ تو میرے یہ خیالات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور ضلع کی انتظامیہ مجھے عضو معطل بنا کر ایک طرف بٹھا دے گی۔ کچھ بحث و مباحثہ کے بعد کانگرسی لیڈر اس بات پر رضامند ہو گئے کہ اگر میں ایک دو روز صبر سے کام لوں تو وہ سپاہی کے قاتلوں کی نشاندہی میں ضرور میری مدد کریں گے۔

گاؤں واپس جا کر راج نرائن پرشاد نے ایک عجیب حماقت کی۔ اس نے کانگرسیوں کے اجتماع میں میرے ہمدردانہ اور معقول رویے کی مبالغہ آمیز تعریف کی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک خاصا بڑا جلوس میرے کیمپ کی جانب روانہ ہو گیا۔ جلوس میں دو ہاتھی' آٹھ دس گھوڑے' کئی ڈھول بجانے والے اور دو ڈھائی سو عوام شامل تھے۔ وہ حکومت کے خلاف کانگرس کے مخصوص نعرے لگا رہے تھے اور بیچ بیچ میں کبھی کبھی "اسسٹنٹ کمشنر جندہ باد" کا نعرہ بھی سنائی دیتا تھا۔ میرے کیمپ کے پاس آ کر جلوس رک گیا۔ اور چند نوجوانوں نے آ کر اصرار کرنا شروع کیا کہ میں ان سے خطاب کروں۔ بڑی منت سماجت سے میں نے انہیں ٹالا اور وہ نعرے لگاتے ڈھول بجاتے خوشی خوشی واپس لوٹ گئے۔ ایک چھوٹی سی بچی نے آگے بڑھ کر گیندے کے پھولوں کا ہار بھی مجھے پہنایا۔

جب یہ خبر بھاگلپور پہنچی تو حکام بالا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اگلی صبح انگریز کلکٹر مسٹر پریڈو' ایس پی مسٹر سٹوک اور اسپیشل ڈیوٹی پر آیا ہوا ایک ڈی آئی جی مسٹر

For more books visit www.4Urdu.com

سٹیوارٹ مشین گنوں اور وائر لیس سے مسلح جیپ میں سوار ہو کر گاؤں پہنچے۔ ان کے ساتھ برما شیل کا بڑا سا ٹینکر تھا جو پٹرول سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

URDU4U.COM

یہ تینوں حضرات بغیر علیک سلیک کے میرے خیمے میں داخل ہوئے۔ میری موجودگی کو سراسر نظر انداز کر کے آپس میں میٹنگ کرنے لگے۔ ان کی گردنیں بپھرے ہوئے خنزیروں کی طرح تنی ہوئی تھیں اور غیظ و غضب سے تمتما کر ان کے چہرے گلے سڑے چقندروں کی طرح سیاہی مائل سرخ ہو رہے تھے۔ ان کا منصوبہ تھا کہ وہ گاؤں کو آبادی سے خالی کر کے پٹرول چھڑک کر آگ لگا دیں اور اسی طرح آس پاس کی فصلوں کو بھی نذر آتش کر دیں تا کہ آزادی مانگنے والوں کی پیٹھ پر خاطر خواہ تازیانہ عبرت لگایا جا سکے۔ جب وہ آپس میں اس نامعقول منصوبے کی تفصیلات طے کرنے لگے۔ تو میں نے انہیں ٹوک کر یاد دلایا کہ یہ خاکسار بھی خیمے میں حاضر ہے اور اپنا مشورہ ان کی خدمت میں پیش کرنے کا خواہشمند ہے۔

ڈی آئی جی نے پستول پر ہاتھ رکھ کر مجھے گالی دی۔ "شٹ اپ یو باسٹرڈ' خیمے سے دفع ہو جاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔ ڈیم سن آف بچ"

کلکٹر اور ایس پی بھی خوب گرجے برسے لیکن میں اڑا رہا کہ میں اس انکوائری کا انچارج ہوں۔ میرے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ایس پی نے اٹھ کر میرے منہ پر زناٹے سے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ میں نے بھی جواب آں غزل کے طور پر اسی طرح کا زور دار چانٹا اس کے منہ پر دے مارا۔ بھاری بھر کم ڈی آئی جی غصے سے چنگھاڑ کر اٹھا' مجھے گردن سے دبوچ کر ہوا میں اچھالا اور میری پیٹھ پر زبردست ٹانگ رسید کر کے خیمے سے باہر پھینک دیا۔

خیمے سے اس طرح برآمد ہو کر میں نے دفعدار شیر خاں سے مشورہ کیا۔ ہم دونوں نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا کہ سرکاری فرائض کی ادائیگی تو بہرحال لازمی ہے۔ لیکن ایک غریب گاؤں کو آگ کے شعلوں سے بچانا بھی ہمارا فرض ہے۔ چنانچہ میں نے تینوں فرنگی افسروں کے نام ایک حکم نامہ لکھا کہ ہر گاہ کہ آپ کے عزائم حکومت' ملک

For more books visit www.4Urdu.com

اور انسانیت کے مفاد کے سراسر خلاف ہیں اس لیے علاقہ مجسٹریٹ کی حیثیت سے میں آپ کو پابند کرتا ہوں کہ تا حکم ثانی آپ خیمے کے اندر ہی تشریف رکھیں۔ اس حکم کے خلاف ورزی کر کے اگر آپ میں سے کسی نے باہر نکلنے کی کوشش کی تو سنگین نتائج کی ذمہ داری آپ کی گردن پر ہو گی۔

URDU4U.COM

دفعدار شیر خاں کی ہدایت پر مسلح پولیس کا دستہ گھوڑوں پر سوار ہو خیمے کا محاصرہ کر کے ایستادہ ہو گیا۔ شیر خاں رائفل کندھے پر رکھ کر اندر گیا' اور سلیوٹ کر کے میرا حکم نامہ میز پر رکھنے کے بعد دروازے کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔

خیمے کے اندر پہلے تضحیکی قہقہے بلند ہوئے۔ پھر فصیح و بلیغ گالیوں کا طوفان اٹھا۔ کچھ دیر بعد کلکٹر مسٹر پریڈو نے اپنی لمبی یہودیانہ ناک ذرا سی باہر نکال کر صورت حال کا جائزہ لیا تو اس کا سر ربڑ کی گیند کی طرح پچک کر شاک سے اندر چلا گیا۔ اس کے بعد خیمے کے اندر مردنی چھا گئی۔

میں نے ان افسروں کی جیپ سے بیئر کی بوتلیں' گلاس' سینڈوچ کے پیکٹ اور وائر لیس کا سیٹ ایک سپاہی کے ہاتھ خیمے میں بھجوا دیا۔ اور برما شیل کے پٹرول ٹینکر کو حکم دیا کہ وہ فوراً بھاگلپور واپس چلا جائے۔

خیمہ میں کچھ دیر سناٹا رہا۔ صرف بیئر کی بوتلوں اور گلاسوں کی کھن کھن سنائی دیتی تھی۔ پھر ایس پی نے وائر لیس سیٹ چلایا اور بھاگلپور پولیس لائن کے ذریعہ کمشنر کے نام کلکٹر کی جانب سے ایک پیغام لکھوایا۔ جب یہ پیغام کمشنر مسٹر بی کے گوکھلے تک پہنچا تو انہوں نے گورا فوج کا ایک دستہ ساتھ لیا اور بہ نفس نفیس ہمارے کیمپ کی جانب روانہ ہو گئے۔

اس اثنا میں اس سارے واقعے کی خبر متاثرہ گاؤں اور اس کے مضافات میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ خبر کم اور قیاس آرائیاں زیادہ۔ کوئی کہتا تھا کہ انگریز افسروں نے مجھے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے' کسی کا خیال تھا کہ میں نے ایک انگریز افسر

For more books visit www.4Urdu.com

مار ڈالا ہے اور دو کو حراست میں لے رکھا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ افواہوں کے اس ریلے میں آٹھ نو سو افراد کا ہجوم ہمارے کیمپ کے آس پاس جمع ہو گیا۔ کچھ لوگ ہاتھیوں اور گھوڑوں پر سوار تھے۔ کچھ بیل گاڑیوں اور رتھوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی مخلوق پاپیادہ تھی۔ یہ لوگ ڈھول بجا رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے اور فرنگیوں کو بے نقط گالیاں دے رہے تھے۔ کمشنر گوکھلے آیا تو بڑے طنطنے سے تھا کہ میری گوشمالی کرے لیکن مجمع کا یہ رنگ دیکھ کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے دم دبا کر کلکٹر' ڈی آئی جی اور ایس پی کو گورا فوج کی حفاظت میں دیا اور مجھے "باغی" مسلح پولیس کے دستے کے ہمراہ فوراً بھاگلپور حاضر ہونے کی تاکید کی۔

ہیڈ کوارٹر پہنچ کر دفعدار شیر خاں اور اس کے ساتھیوں کو نہتا کر کے کوارٹر گارڈ کر دیا گیا اور مجھے نااہلی' بد انتظامی' سرکشی' حکم عدولی اور مسلح پولیس کو بغاوت پر اکسانے کی چارج شیٹ ملی۔

جواب میں میں نے آئی سی ایس سے دو سطری استعفیٰ لکھ دیا۔

چند روز بعد صوبہ بہار کے انگریز گورنر نے مجھے صبح کے ناشتے پر گورنمنٹ ہاؤس پٹنہ میں مدعو کیا۔ ان کی فرمائش پر میں نے سارا واقعہ حرف بہ حرف بیان کر دیا' جسے سن کر انہوں نے میرا استعفیٰ مجھے واپس کر دیا۔ اور بولے۔ "شاباش' تم نے صورت حال کو مزید پیچیدہ ہونے سے بچا لیا۔ اس پر تمہیں مستعفی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

گورنر کے حکم پر میں نے اس سارے واقعہ کی تحریری رپورٹ بھی ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ اس کے دو ڈھائی ماہ بعد ایک روز مجھے اچانک یہ حکم ملا کہ میں نئی دہلی میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ہوم ممبر کی خدمت میں حاضری دوں۔ ان کا اسم گرامی سر ریجنیالڈ میکسویل تھا۔ یہ ایک مسخرے سے بیمار صورت آدمی تھے۔ اس سانحہ کے متعلق ان کے سامنے کئی متضاد رپورٹیں تھیں۔ گورنر کی رپورٹ میرے حق میں تھی۔ لیکن چند انگریز افسروں نے دیگر ذرائع سے اس کے برعکس رپورٹیں پہنچا رکھی تھیں۔

For more books visit www.4Urdu.com

جب میں مقررہ وقت پر سر ریجنیالڈ کے دفتر پہنچا' تو وہاں کونسل کے ایک مسلمان ممبر سر سلطان احمد بھی موجود تھے۔ ہوم ممبر نے ان کے سامنے مجھے بری طرح لتاڑنا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید سر سلطان احمد میرے حق میں کچھ کلمات خیر ارشاد فرمائیں گے۔ وہ صوبہ بہار کے رہنے والے تھے۔ وہاں کے صحیح واقعات سے پوری طرح واقف تھے اور پٹنہ میں میری ان کی تھوڑی بہت صاحب سلامت بھی تھی۔ لیکن وہ دم سادھے چپ چاپ بیٹھ رہے۔ جب ہوم ممبر آٹھ دس منٹ بول چکے تو انہوں نے قدرے چیخ کر کہا۔ "تم بھی تو کچھ بولو۔" کیا تمہارے منہ میں زبان نہیں۔"

میں نے جواب دیا۔ "سر' میں اپنی تحریری رپورٹ گورنر کو دے چکا ہوں۔ اپنا استعفیٰ بھی پیش کیا تھا۔ اگر آپ چاہیں تو میں تحریری رپورٹ یا استعفیٰ دونوں از سر نو آپ کی خدمت میں پیش کر دوں؟"

"بے تکی اور غیر متعلق باتوں سے میرا وقت ضائع مت کرو۔" انہوں نے جھنجلا کر کہا۔ "کیا تمہارے پاس اپنی صفائی میں ایک بھی معقول دلیل نہیں ہے؟"

میں نے ملائمت سے کہا۔ "سر' آپ آئی سی ایس کے آخری زینے پر ہیں۔ میں ابھی پہلی سیڑھی پر ہوں۔ اگر آپ میری جگہ موقع واردات پر ہوتے تو اپنے وسیع تر تجربے کی روشنی میں کیا قدم اٹھاتے؟"

اس پر ہوم ممبر سرکس کے کلاؤن کی طرح اپنی کرسی پر گھومے' اور ہنس کر بولے۔ "غالباً وہی جو تم نے اٹھایا۔ تمہارا فیصلہ صحیح لیکن طریق کار غلط تھا۔ خیر جاؤ' آئندہ احتیاط برتنا۔"

میں نے پوچھا کہ دفعدار شیر خاں اور اس کے ساتھیوں کا کیا حشر ہو گا؟ سر ریجنیالڈ نے کہا کہ ان کے خلاف بھی کوئی ایکشن نہیں لیا گیا' البتہ انہیں صوبہ بہار سے کہیں اور تبدیل کیا جا رہا ہے۔

جب میں ہوم ممبر کے کمرے سے نکلا تو سر سلطان احمد بھی میرے ساتھ ہی باہر آ گئے۔ انہوں نے بڑی شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مشورہ دیا کہ آئی سی

For more books visit www.4Urdu.com

ایس میں پہلے ہی مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ ملازمت کے سلسلے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ چائے پلائی اور کچھ دیر تک اپنی قومی خدمات کا ذکر کرتے رہے۔

URDU4U.COM

اس کے بعد دوبارہ سابق صدر اسکندر مرزا اور ایک بار فیلڈ مارشل ایوب خاں کے زمانے میں بھی ملازمت سے استعفیٰ دینے کا شوق چرایا' لیکن تینوں بار تیر نشانے پر نہ بیٹھ سکا۔

لیکن جب یحییٰ خاں اپنے بے ضمیر باطن کی اندھیر نگری سے چوپٹ راجہ بن کر ارض پاک پر نازل ہوا' تو میرے اندر کسی دبے ہوئے جنون نے بھی کروٹ لی۔ اس شخص کو میں مدت سے پہچانتا تھا۔ اس کی پیشانی پر بے برکتی اور بد توفیقی کی ایک واضح مہر ثبت تھی۔ جن دنوں آزاد کشمیر کا جہاد زوروں پر تھا' یحییٰ خاں کسی سلسلے میں پونچھ فرنٹ کی طرف آیا۔ میں آزاد کشمیر حکومت کا سیکرٹری جنرل تھا۔ پلندری اور تراڑ کھیل کے درمیان ایک پہاڑی جونجال ہل پر ہمارا سیکرٹریٹ واقع تھا۔ یہاں پر چند کچے مکان تھے جن میں آزاد کشمیر کے صدر' وزراء اور دوسرے ملازمین کی رہائش گاہیں اور دفاتر تھے۔ دن کے وقت سیکرٹریٹ کا کام عموماً درختوں کے سائے میں ہوتا تھا۔ کسی کے پاس لوہے کی کرسی تھی۔ کسی کے پاس چوبی اسٹول' کوئی پتھروں کا چبوترہ بنا کر بیٹھتا تھا' کوئی گھاس پر نیم دراز ہو کر فائلیں چلاتا تھا۔ دن میں کئی بار ہندوستان کے بمبار طیارے ہمارے اوپر سے گزرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی پرواز اس قدر نیچی ہوتی تھی کہ پائلٹ کا چہرہ تک نظر آنے لگتا تھا۔ ایک روز ہم کوئی میٹنگ کر رہے تھے کہ ایک گول مٹول سا فوجی جیپ سے اتر کر ہمارے پاس آیا۔ چہرے پر سوجن اور آنکھوں میں گندے انڈے کی ابلی ہوی زردی سی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بید کی چھڑی اور دوسرے میں چمڑے کا گول تھیلا تھا۔ آتے ہی اس نے اپنی جھونپڑی میری ناک کے عین سامنے گھمائی اور قدرے ڈانٹ کر پوچھا۔ "یہاں کیا تماشا ہو رہا ہے؟"

میں نے عرض کیا کہ یہ آزاد جموں و کشمیر گورنمنٹ کا سیکرٹریٹ ہے۔

For more books visit www.4Urdu.com

یہ سن کر اس کی توند تسلے میں پڑی ہوئی باسی اوجھڑی کی طرح گدگدائی اور گلے سے غوغو غاغا کی کچھ رندھی ہوئی آوازیں برآمد ہوئیں۔ یہ اس بات کی دلیل تھی' کہ آغا محمد یحییٰ خاں صاحب ازراہ تمسخر قہقہہ فرما رہے ہیں۔ ہمارے سیکرٹریٹ کی ہیئت کذائی پر چند تحقیری اور تضحیکی پھبتیاں کسنے کے بعد آغا صاحب بور ہو گئے اور کچھ دور پرے جا کر درختوں کی اوٹ میں ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ اپنا تھیلا کھول کر انہوں نے کچھ سینڈوچ نوش فرمائے' اور پھر پیاس بجھانے کے لیے غالباً بیئر کی بوتل نکالی۔ رمضان کے دن تھے۔ یہ دیکھ کر میرا پونچھی اردلی جلال میں آ گیا اور اس نے دور ہی دور سے انہیں للکارا۔ "خبردار صاحب! یہ حرام بند کرو' ابھی ابھی مینڈھر کی وادی ہمارے ہاتھ سے نکل کر ہندوستان کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ اب خدا کے غضب کو اور نہ بلاؤ۔ بوتل توڑ دو۔ ورنہ خون خرابہ ہو جائے گا۔"

یحییٰ خاں نے بوتل تو نہ توڑی۔ لیکن جلدی جلدی سامان سمیٹ کر زیر لب بڑبڑاتا ہوا نو دو گیارہ ہو گیا۔

کئی برس بعد مجھے یحییٰ خاں کی زیارت ایک اور رنگ میں نصیب ہوئی۔ جب پاکستان کا دارالخلافہ راولپنڈی اور اسلام آباد منتقل ہو رہا تھا' تو ارباب پنڈی کلب نے کراچی سے تازہ واردان بساط ہوائے دل کی خیر سگالی کے لیے ایک زبردست محفل ناؤ نوش منعقد کی۔ مارشل لاء کا بول بالا تھا۔ کئی سول سرونٹ چند کلیدی فوجی حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ کچھ بیگمات بھی اس مہم میں اپنے خاوندوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے سج دھج کر شریک محفل تھیں۔ اس انجمن میں یحییٰ خاں چہک چہک کر پھدک پھدک کر کبھی ایک بیگم کبھی دوسری بیگم سے ٹکراتا تھا۔ بڑی محنت مشقت کے بعد اس نے ایک طرحدار خاتون کو پھانسا اور اسے گھیر گھار کر باہر لان میں لے گیا۔ کچھ دیر آنکھ مچولی کا کھیل ہوتا رہا۔ بد مستی کے عالم میں یحییٰ خاں کی بیہمانہ ہنہناہٹ اور طرحدار خاتون کے نرم و نازک قہقہے اندر بیٹھے ہوئے دوسرے امیدواروں

For more books visit www.4Urdu.com

کی چھاتی پر مونگ دلتے رہے۔ پھر زور کا دھماکا ہوا' اور سب لوگ بھاگ کر باہر آ گئے۔ خاتون تو ایک میز پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی بڑے آرام سے شیمپئن کا جام پی رہی تھی لیکن غریب یحییٰ خاں کسی کرسی سے ٹکرا کر آدھ موئے دنبے کی طرح زمین پر چاروں شانے چت گرا پڑا تھا۔ یار لوگوں نے دھکیل دھکال کر اسے بٹھایا۔ وہ حنوط شدہ اکڑی ہوئی لاش کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا اور کسی نے اس کی پتلون اوپر کھینچ کر توند کے نشیب پر از سر نو فٹ کی۔

جس زمانے میں فیلڈ مارشل ایوب خاں نے یحییٰ خاں کو فیڈرل کیپٹل کمشن کا چیئرمین نامزد کیا تو میں اس حسن انتخاب پر عش عش کر اٹھا۔ میں نے سوچا کہ فیلڈ مارشل نے غضب کی مردم شناسی سے کام لیا ہے۔ اور بڑی حکمت عملی سے اس شخص کو فوج سے الگ کر کے کیپٹل کمیشن کی پول میں دھانس دیا ہے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے جب سابق صدر ایوب نے اس مخمور اور بد مست شخص کو پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف بنا ڈالا تو یہ راز کھلا کہ یہ مردم شناسی کا اعجاز نہیں۔ بلکہ خود حفاظتی کی ڈھال کے طور پر کوئی معشوق ہے اس پردۂ نگاری میں!

کمانڈر انچیف کے عہدے پر فائز ہوتے ہی آغا صاحب نے فوج کی قیادت کے علاوہ ملک کی صدارت کی ریہرسل بھی شروع کر دی۔ اس ریہرسل کا پہلا زریں موقع یحییٰ خاں کو اس وقت ملا جب ۱۹۶۸ء کی جنوری میں ایک رات فیلڈ مارشل ایوب خاں پر اچانک عارضہ قلب کا شدید حملہ ہوا۔ وہ تو رفتہ رفتہ صحت یاب ہو گئے لیکن یحییٰ خاں کو صدارت کی اس ریہرسل کا کچھ ایسا چسکا پڑا کہ اب اس نے برسر اقتدار آنے کی با ضابطہ منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اس جوڑ توڑ کو پروان چڑھانے کے لیے اسے بڑی آسانی سے ایک سدھا سدھایا بھاڑے کا ٹٹو بھی پاس ہی مل گیا۔ اس شخص کا نام میجر جنرل ایس جی ایم' ایم پیر زادہ تھا۔ جس زمانے میں وہ صدر ایوب کا ملٹری سیکرٹری بن کر آیا تھا' اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر وقت بلا وجہ مسکرانے کی کوشش میں

For more books visit www.4Urdu.com

رہا کرتا تھا۔ ریا کاری کے اس رندے نے اس کے چہرے پر دو ایسی مستقل سلوٹیں تراش رکھی تھیں کہ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی کا منہ چڑھا رہا ہے۔ یوں بھی اس کے کان کی لوؤں اور چہرے بشرے کے مساموں سے گنجلک' روباہی' چکمہ سازی' حیلہ گری اور ہچر مچر کا گدلا سا لعاب اس طرح رس رس کر ٹپکتا تھا جیسے چیڑ کے تنے سے لٹکے ہوئے بدھنے میں لیسدار گندہ بیرونہ قطرہ قطرہ پھسل کر گرتا ہے۔ کبھی کبھی جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوتا تھا تو خبث باطن کا تعفن پھٹے ہوئے گٹر کی سڑاند کی مانند چاروں طرف پھیل جاتا تھا اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ لپک کر بہت سی کھڑکیاں کھول دی جائیں اور باہر کی صاف ہوا کو اندر آنے دیا جائے۔

ملٹری سیکرٹری کے طور پر کام کرتے ہوئے میجر جنرل پیر زادہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس پر بھی دل کا دورہ پڑا۔ چند ماہ بعد صدر ایوب نے اسے جی ایچ کیو واپس بھیج دیا۔ یہ واپسی اس کی خواہش اور توقع کے خلاف تھی۔ اس لیے جاتے وقت وہ علی بابا چالیس چور کی مرجینا کی طرح ایوان صدر کے پھاٹک پر اپنی ناکام آرزوؤں کی کالک سے اپنی مراجعت کے عزم کا نشان ڈالتا گیا۔

اس کے بعد جنرل پیر زادہ سے میری ملاقات چند بار بریگیڈیئر ایف آر خاں کے گھر پر ہوئی۔ جہاں وہ مفت کی شراب پینے بالالتزام آیا کرتا تھا۔ شراب کے نشے میں دھت ہو کر وہ اکثر قالین پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ جاتا تھا۔ اور ملک کے بگڑتے ہوئے حالات پر بے ربط قسم کا تبصرہ شروع کر دیتا تھا۔ ایک روز موضوع سخن بدلنے کے لیے میں نے اس سے کہا کہ افواج پاکستان کی پنشن کمیٹی نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ جنرل یحییٰ کی رائے بھی لی جائے کہ کمانڈر انچیف کی پنشن متعین کرنے کے لیے کیا فارمولا وضع کرنا چاہیے؟ یہ سن کر میجر جنرل پیر زادہ فوراً اکڑوں ہو کر بیٹھ گیا۔ شراب کے نشے میں بکھری ہوئی اس کی ٹیڑھی ترچھی آنکھیں سمٹ کر سکڑ گئیں' جیسے پلاسٹک کے باوا کو ملایا جائے تو اس کی آنکھوں کے منکے گھوم

For more books visit www.4Urdu.com

گھوم کر ایک دوسرے کے پاس آ جاتے ہیں۔ اس نے سر جھٹکوڑ کر زور سے تمسخر بھرا قہقہہ لگایا اور بولا۔ "تم اس فکر میں نہ پڑو۔ کمانڈر انچیف کی پنشن تمہارے بس کا روگ نہیں۔ وقت آنے پر آغا جنرل محمد یحییٰ اسے خود ہی طے کر لیں گے۔ انشاء اللہ"

پاکستان کی بحری' بری اور فضائی افواج کے لیے ایک منظم اور باضابطہ پنشن کوڈ تجویز کرنے کے لیے حکومت نے ایک کمیٹی قائم کی تھی۔ میں اس کا چیئرمین تھا۔ اور بریگیڈیئر عبدالحمید کموڈور اے حمید اور گروپ کیپٹن غلام حسن اس کے ممبر تھے۔ یہ تینوں افسر بڑے محنتی' لائق اور واقعیت شناس تھے۔ ایک برس کی لگاتار محنت کے بعد ہم نے کوڈ مرتب کر لی۔ اسے آخری شکل دینے سے پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ بحریہ' فضائیہ اور بری افواج کے سربراہوں سے بھی مشورہ کر لیا جائے کہ ان کے ہم مرتبہ افسروں کی پنشن کن اصولوں کے تحت تجویز کی جائے۔ ایئر فورس اور نیوی کے سربراہوں نے تو اپنی رائے دے دی لیکن جنرل یحییٰ چپ سادھ کر بیٹھ گیا۔ تنگ آ کر میں نے وزیر دفاع ایڈمرل اے آر خاں سے اس بات کا ذکر کیا۔ تو انہوں نے مجھے اپنے ہمراہ لے کر یحییٰ خاں کی خدمت میں خود حاضر ہونے کی حامی بھر لی۔ راستے میں میں نے ان سے پوچھا۔ "وزیر دفاع کے طور پر آپ کو یہ اختیار ہو گا کہ آپ آرمی کے کمانڈر انچیف کو اپنے دفتر میں بھی طلب کر سکیں؟" ایڈمرل صاحب نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

جی ایچ کیو پہنچ کر پنشن کے متعلق جنرل یحییٰ سے جتنے سوال پوچھے گئے۔ غالباً وہ سب اسے کسی قدر ناگوار گزرے۔ جس غیر سنجیدہ اور لا ابالی انداز میں اس نے سارے مسئلہ کو ٹرخا دیا۔ اس سے عیاں ہوتا تھا کہ کمانڈر انچیف کے عہدے سے پنشن پر جانا اس شخص کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔

ایوب خاں کے زوال پر جس روز یحییٰ خاں نے زندہ ناچ گانے کے ساتھ اپنا جشن تاجپوشی منایا۔ اسی روز جنرل پیر زادہ نے بھی ایوان صدر پر قبضہ کر کے اس میں اپنا آسن جما لیا۔ اس گھر کی غلام گردشوں سے وہ پہلے ہی بخوبی واقف تھا۔ یہ ایک ایسے بے برکتے

For more books visit www.4Urdu.com

دور کی ابتدا تھی جس کی بسم اللہ ہی الٹی پڑی۔ اگلے روز اس کے ایماء پر ایک حکمنامہ جاری ہوا کہ ایڈمرل اے آر خاں' سید فدا حسین شاہ اور میاں ارشد حسین کو صدر پاکستان کا مشیر مقرر کیا گیا ہے۔ یہ خبر پا کر فضائیہ اور بحریہ کے کمانڈر انچیف یحییٰ خاں پر چڑھ دوڑے۔ اور ایک ہنگامی میٹنگ میں انہوں نے مارشل لاء کے مال غنیمت میں اپنا اپنا حصہ طلب کیا۔ یہ میٹنگ اس قدر طوفانی تھی کہ ایک کمانڈر انچیف نے جو عام طور پر شراب نہیں پیتے تھے' برانڈی کا آدھا گلاس منگوایا اور اسے ایک ہی سانس میں غٹاغٹ چڑھا گئے۔

جنرل پیر زادہ نے ہاتھ پاؤں تو بہت مارے لیکن مشیروں کی تقرری کا پروانہ منسوخ ہو گیا اور ان کی جگہ ایک مشترکہ انتظامی کونسل قائم ہوئی' جو جنرل عبدالحمید' ایئر مارشل نور خاں اور ایڈمرل احسن پر مشتمل تھی۔ مرکزی حکومت کی وزارتیں ان تینوں میں بٹ گئیں اور میجر جنرل پیر زادہ یحییٰ خاں کو سنبھال کر بیٹھ نہیں گیا۔ بلکہ انتظامیہ کونسل کو درہم برہم کرنے کی سازش میں مصروف ہو گیا۔

جنرل عبدالحمید خاں اپنے حصوں کی وزارتوں میں زیادہ دخل نہیں دیتے تھے' کیونکہ ان کی زیادہ تر توجہ فوجی ہیڈ کوارٹر کے کام پر مرکوز تھی۔ ایڈمرل احسن بھی میانہ رو انسان تھے۔ البتہ ایئر مارشل نور خاں نے اپنا کام بڑی سنجیدگی سے شروع کیا۔ وزارت تعلیم انہی کے چارج میں تھی۔ وہ چکلالہ کے ایئر فورس بیس میں رہتے تھے اور اسلام آباد سیکرٹریٹ ہیلی کاپٹر سے اڑ کر آیا جایا کرتے تھے۔ بات چیت میں وہ گفتگو کم اور تقریر زیادہ فرماتے تھے۔ اور کام کاج میں پھرتیلی اور نیم پختہ منصوبہ بندی کی نمائش نسبتاً زیادہ ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنے ارد گرد چند پڑھے لکھے ذہین نوجوانوں کا گروپ جمع کر رکھا تھا جن کے خیالات کرید کرید کر وہ اپنے کام میں لایا کرتے تھے۔ کم از کم تعلیم کے متعلق ایئر مارشل کا انداز فکر کچھ اس قسم کا تھا' کہ علم صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا جنہیں سست روی سے ورق ورق الٹنا پڑتا ہے' بلکہ یہ ہوائی جہازوں میں لاد

For more books visit www.4Urdu.com

کر اڑانے والا کوئی کارگو ہے۔ پہلے روز جس طمطراق سے انہوں نے وزارت تعلیم پر نزول اجلال فرمایا۔ اس سے عیاں ہوتا تھا کہ وہ جب چاہیں گے کھڑکی سے منہ نکال کر "کھل جا سم سم" کا نعرہ لگائیں گے۔ اور مارگلا ہل کی چٹانوں سے فوراً علم و ہنر کے چشمے پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگیں گے۔

مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد دس دن تک مرکزی سیکرٹریٹ کا کام کم و بیش معطل رہا۔ کیونکہ نیا حکمران ٹولہ کاروبار سلطنت کی بندر بانٹ میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ہم لوگ دفتر جاتے تھے' چائے پیتے تھے۔ قیاس آرائیاں کرتے تھے اور اس طرح دن بھر کی روزی حلال کر کے گھر آ جاتے تھے۔ ان ایام میں سول سیکرٹریٹ کا اپنی حکومت کے ساتھ ہمارا واحد رابطہ روزانہ اخبارات کے ذریعہ تھا۔

ان دس دنوں میں ملک پر بلا شرکت غیرے نظام سقے کا راج تھا جس نے سالہا سال کی سازشوں کے آواگونی چکر سے نکل کر میجر جنرل پیر زادہ کی صورت میں نیا جنم لیا تھا۔ چام کے دام تو اس نے بعد میں قوم کی کھال سے چلائے لیکن اس دس روز کی بادشاہی میں اس کے زریں کارنامے جو ہم تک مختلف ذرائع سے پہنچتے رہے' کچھ اس طرح کے تھے۔

آج فلاں دفتر کے دروازے سات بج کر بیس منٹ پر بند کر دیئے گئے۔ دیر سے دفتر پہنچنے والوں کو فٹ پاتھ پر دھوپ میں کھڑا کر دیا گیا۔

آج ایک دفتر کی اچانک حاضری بلائی گئی' غیر حاضر ملازمین کی جواب طلبی۔

آج سڑکوں پر جھاڑو پھر گئی۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر غائب۔

آج نالیوں کی صفائی کا حکم نامہ جاری ہو گیا' اور فینائل چھڑکی گئی۔

آج مکھی مارنے کی مہم کا آغاز ہو گیا۔

آج دودھ' دہی اور مٹھائی کی دکانوں پر جالی لگانے کے احکامات صادر ہو گئے۔

آج یہ ------ آج وہ ------

پھر اچانک ایک حکمنامہ آیا کہ کل مورخہ ۴ اپریل صبح دس بجے صدر پاکستان اور

For more books visit www.4Urdu.com

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر آغا جنرل محمد یحییٰ خاں پریذیڈنٹ گیسٹ ہاؤس میں مرکزی سیکرٹریوں اور دیگر اعلیٰ سول حکام سے خطاب فرمائیں گے۔

URDU4U.COM

بارے مارشل لاء ٹولے کو یاد تو آیا کہ پاکستان میں سول سیکرٹریٹ نام کی کسی شے کا بھی کوئی وجود موجود ہے۔ مارشل لاء لگے ہوئے دس روز گزر چکے تھے۔ اس تمام عرصہ میں یہ برگزیدہ لوگ یا تو اقتدار کی باہمی چھینا جھپٹی میں الجھے ہوئے تھے یا دفتروں کی حاضریاں گن کر' سڑکوں پر جھاڑو پھروا کر' یا نالیاں صاف کروا کر قوم کے ہنگامی مسائل حل کرنے میں مصروف تھے۔ اب تک کسی سول افسر کو ایوان صدارت یا چیف مارشل لاء ہیڈ کوارٹر تک باریابی کا شرف حاصل نہ ہوا تھا' بیوروکریسی کے کچھ خاص گرد آلود پیادے جو چڑھتے سورج کی پرستش پر ایمان رکھتے ہیں۔ انتظار کی گھڑیاں گن گن کر چور ہو گئے تھے کہ کب نئے خداوندان نعمت کی زیارت نصیب ہو اور کب وہ اپنا ہدیہ دل ان کے قدموں پر نثار کریں۔ آخر ان کی امید بر آئی۔ میٹنگ کا نوٹس وصول ہوتے ہی ہمہ وقت کورنش بجانے والے کئی افسروں کی خمیدہ کمر میں جی حضوری کی ایک تازہ لچک پیدا ہو گئی۔

اگلی صبح میں پونے دس بجے پریذیڈنٹ گیسٹ ہاؤس پہنچا۔ میٹنگ کا کمرہ پہلے ہی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پہلی صف میں فوجی ہی فوجی بھرے ہوئے تھے۔ صرف ایک کنارے پر چار سینئر سیکرٹری کسی قدر ہچکچے ہوئے سے بیٹھے تھے۔ باقی افسران کرام پچھلی صفوں پر تھے۔ میں بھی کہیں ایک خالی کرسی پا کر بیٹھ گیا۔

جب دس بجے تو ہم سب کن انکھیوں سے بار بار دروازے کی طرف جھانکنے لگے۔ لیکن یحییٰ خاں ہے کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ آخر عین دس بج کر چالیس منٹ پر آگے آگے یحییٰ خاں اور اس کے پیچھے میجر جنرل پیر زادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ صدر کے چہرے پر ایک درشت گھر کی چمگادڑ کے پروں کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ پیر زادہ کے گالوں پر مصنوعی مسکراہٹ کی دو مستقل سلوٹیں سنجیدگی کا غازہ لگا کر مردار جھریوں کی

For more books visit www.4Urdu.com

طرح لٹکی ہوئی تھیں۔

یحییٰ خاں مغلئی انداز سے چھاتی نکال کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور ہم سب پر حقارت سے بھرپور نظر دوڑائی۔ چند لمحے کمرے میں سناٹا طاری رہا۔ پھر اس نے منہ کھولا اور ڈانٹ ڈپٹ کے لہجے میں بڑی اچھی باتیں کیں۔ اس نے کہا۔ "تم سول سرونٹ بڑے خوشامدی اور چاپلوس لوگ ہو۔ تم ہر نئے حکمران کی ہاں میں ہاں ملا کر اسے غلط راستے پر لگاتے ہو۔ تم اخلاقی جرات سے عاری ہو۔ صحیح رائے دینے سے احتراز کرتے ہو۔ خوشامد اور جی حضوری سے کام لے کر اپنا الو سیدھا کرتے ہو۔ لیکن اب خبردار ہو جاؤ۔ میں سیدھا سادا سپاہی آدمی ہوں۔ میں تمہارے ہتھکنڈوں میں نہیں آؤں گا۔ میرے ساتھ صاف گوئی سے کام لینا ہو گا میں اپنی خوشی سے صدارت کی کرسی پر نہیں بیٹھا۔ تم لوگوں کی مہربانی سے ایوب خاں ناکام ہو گیا۔ ملک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے اسے بچانے کا فرض مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ میں اس فرض کو پورا کرنے آیا ہوں۔ میں اس فرض کو پورا کر کے رہوں گا۔ میں جلد از جلد ملک میں نارمل حالات پیدا کر کے اپنی بیرک میں واپس چلا جاؤں گا۔ تم لوگ بھی ہوش میں آ جاؤ۔ اپنا کام تندہی سے کرو' جرات سے کام لے کر سیدھی بات کرو۔ بے لاگ رائے دو۔ خوشامد سے پرہیز کرو۔ اگر کسی نے کوئی سوال پوچھنا ہے تو خوشی سے صاف صاف پوچھو۔ میں سولجر آدمی ہوں۔"

دس پندرہ منٹ اس قسم کی معقول باتیں کر کے یحییٰ خاں خاموش ہو گیا۔ پھر سول سروس کے ہیڈ پوپ مسٹر ایم ایم احمد نے لب کشائی کی۔ انہوں نے کھڑے ہو کر نماز توبہ کی نیت تو نہ باندھی لیکن بڑے خضوع و خشوع سے اعتراف جرم کا خطبہ دیا' کہ بے شک سول سرونٹ سے بڑی بڑی کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں' لیکن الحمدللہ کہ اب اللہ تعالیٰ نے ملک پر رحم فرمایا ہے۔ ماشاء اللہ آپ جیسا ناخدا اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو نصیب ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم آپ کو اپنی بے لوث خدمت

For more books visit www.4Urdu.com

اور وفاداری کا پر خلوص یقین دلاتے ہیں۔

ایک دو اور حضرات نے بھی حسب توفیق اسی طرح کے خوشامدانہ کلمات خیر ارشاد فرمائے۔

یحییٰ خاں نے اپنا گول مٹول سر ہلا ہلا کر چاپلوسی کا یہ نذرانہ بڑی گرمجوشی سے قبول کیا۔ اس کی گدلی گدلی آنکھوں سے فخر و مباہات کی شعاعیں پھوٹ نکلیں۔ اس کا نیلا نیلا' پیلا پیلا سوجا ہوا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اس کی لٹکی ہوئی ڈھیلی ڈھالی ٹھوڑی گھوڑے کی زین کی طرح کس گئی۔ اور کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

اس خاموشی کو میں نے اٹھ کر توڑا۔

"مسٹر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر" میں نے کھڑے ہو کر یحییٰ خاں کو مخاطب کیا۔

اس طرز تخاطب پر یحییٰ خاں کے کان کھڑے ہوئے۔ پھر اس نے اپنا سر جھٹک کر اوپر اٹھایا اور نیم باز آنکھوں سے گھور گھور کر مجھے دیکھا۔ اگلی صف میں لٹکی ہوئی تمام گردنیں بھی بے پیندے کے لوٹوں کی طرح گھوم کر مجھے تاکنے لگیں۔

"مسٹر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر" میں نے کہا۔ "میں صرف سرکاری ملازم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست کی طرح کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں ہاں" یحییٰ خاں نے جھنجھلا کر کہا۔ "ہم بھی تو دوست ہیں' ہم کوئی بالشویکی تو نہیں۔"

"سر" میں نے کہا۔ "آپ نے صاف گوئی کا حکم دیا ہے' اس لیے میں جو کچھ کہوں گا بلا کم و کاست عرض کروں گا۔"

"ہاں ہاں' بولو بولو" یحییٰ خاں نے گھڑی دیکھ کر مزید جھنجلاہٹ سے کہا۔

"جناب" میں نے گزارش کی۔ "پچھلے دس برس میں یہ دوسری بار مارشل لاء نافذ ہوا ہے۔ یہ بیچارہ ملک بار بار مارشل لاء کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس لیے ------"

اگلی صف میں پہلے کھسر پھسر ہوئی۔ پھر "اس لیے کیا؟" ------ "اس لیے کیا؟" کی چند طنزیہ سول اور ملٹری آوازیں بلند ہوئیں۔

"اس لیے جناب!" میں نے کہا۔ "جس کام کا بیڑا اٹھا کر آپ تشریف لائے ہیں' اسے

For more books visit www.4Urdu.com

جلد از جلد شروع کر کے ------"

اگلی صف سے پھر انواع و اقسام کے آوازے بلند ہوئے۔

"یہ کیا بات ہوئی جی؟"

"یہ بھی کوئی بات ہے بھلا؟"

URDU4U.COM

"سب کام ہو رہے ہیں۔"

"سب کچھ شروع ہے جی"

ان آوازوں کے حق میں یحییٰ خاں نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ اور مجھے ڈانٹ کر پوچھا۔

"کیا تم صبح اٹھ کر اخبار نہیں پڑھتے؟"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا۔ "آج کل خاص طور پر ضرور پڑھتا ہوں۔ کیونکہ اپنی حکومت کے ساتھ آج کل ہمارا یہی واحد رابطہ ہے۔"

"کیا پڑھتے ہو؟" یحییٰ خاں نے جھلا کر کہا۔ "یہ پڑھتے ہو کہ ہم بیکار بیٹھے ہیں؟ ہم کچھ کام نہیں کر رہے؟"

"جناب!" میں نے کہا۔ "سڑکیں صاف ہو رہی ہیں' نالیوں میں فینائل چھڑکی جا رہی ہے' دکانوں میں جالیاں اور دفتروں میں حاضریاں لگ رہی ہیں اور ------"

"اور' اور کیا؟" یحییٰ خاں نے مجھے غصے سے ٹوکا۔ "کیا یہ ضروری کام نہیں ہیں؟"

"سر" میں نے جواب دیا۔ "یہ کام ضروری تو ہیں لیکن ان کے لیے مارشل لاء ضروری نہیں۔ آپ کے اپنے اعلان کے مطابق مارشل لاء کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ -------

ایک بار پھر اگلی صف میں شور برپا ہو گیا۔ بھانت بھانت کی آوازیں بھانت بھانت کا غوغا مچا رہی تھیں۔ ان سب کا خیال تھا کہ یہ شخص خواہ مخواہ اس میٹنگ کا وقت ضائع کر رہا ہے۔ ورنہ مارشل لاء جن مقاصد کو پورا کرنے آیا ہے وہ نہایت خوش اسلوبی سے پورے ہو رہے ہیں۔ میں بدستور اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جب یہ شور و شر قدرے فرو ہوا تو میں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے پھر مخاطب کیا۔

"سر" میں نے پوچھا۔ "کیا میں اپنی بات پوری کر سکتا ہوں۔"

For more books visit www.4Urdu.com

یحییٰ خاں نے میری گزارش سنی ان سنی کر کے کہا۔ "چلو چلو' اب چائے پئیں۔"
چائے کے کمرے میں یحییٰ خاں مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میجر جنرل پیر زادہ بھی چیل کی طرح ہمارے آس پاس منڈلاتا رہا۔ یحییٰ خاں بولا۔ "بھئی ہم لوگ صرف کرنے والے خاکروب ہی تو نہیں' تم دیکھتے جاؤ۔ ہم تو بہت بڑے کام کرنے والے ہیں۔"
میں نے جواب دیا۔ "آپ بے شک بڑے بڑے کام کریں لیکن ایک بات کا ضرور خیال رکھیں۔"
"وہ کیا؟" یحییٰ خاں نے پوچھا۔
میں نے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ انگریزی فوج میں اگر کوئی ٹامی رومن حروف میں تھوڑا بہت اردو سیکھ لیتا ہے تو اسے برصغیر کے معاملات کا ماہر سمجھ لیا جاتا تھا۔ یہ میجر جنرل پیرزادہ جو ہماری طرف کان لگائے آس پاس منڈلا رہا ہے' کچھ عرصہ صدر ایوب کا ملٹری سیکرٹری رہ چکا ہے۔ اب کہیں اس وجہ سے آپ اسے پاکستانی امور سلطنت کا ماہر نہ سمجھ بیٹھیں۔
یہ سن کر یحییٰ خاں جنگلی بلے کی طرح مجھ پر غرایا۔ اس کی دیکھا دیکھی پیر زادہ بھی غراتا ہوا ہماری طرف لپکا۔ ان دونوں کی غراہٹ آس پاس کھڑے ہوئے کئی دوسرے افسروں نے بھی سنی۔ جب میں اپنے لیے چائے کی پیالی لینے ان کی میز پر گیا تو یہ لوگ بدحواسی میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے وہاں سے فوراً تتر بتر ہو گئے۔ البتہ ہوم سیکرٹری اے بی اعوان صاحب سکون سے کھڑے رہے اور میرے ساتھ باتیں کرتے رہے۔
اگلے روز صبح سویرے راجہ صاحب محمود آباد ہمارے ہاں تشریف لائے۔ ان کے ساتھ میرے دیرینہ برادرانہ تعلقات تھے' انہوں نے مجھے بتایا کہ کل رات یحییٰ خاں نے انہیں اور اسٹینڈرڈ بنک کے مسٹر علوی کو ڈنر پر مدعو کیا ہوا تھا۔ جوں جوں وہسکی کا نشہ تیز سے تیز تر ہوتا جاتا تھا۔ یحییٰ خاں گفتگو کے باقی تمام موضوع چھوڑ کر اس خاکسار پر برسنا

For more books visit www.4Urdu.com

شروع کر دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صبح کی میٹنگ میں لب کشائی کر کے میں نے مارشل لاء اور حکمران ٹولے کے خلاف مزاحمت کا جذبہ اکسانے کی کوشش کی ہے۔

URDU4U.COM

راجہ صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ میں صبر و تحمل سے کام لوں اور اپنی ملازمت کے کے بارے میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کروں۔

اسی روز اسٹینڈرڈ بنک کے مسٹر علوی بھی ہمارے ہاں آئے۔ ان کی ذات شریف سے میرے کوئی مراسم نہ تھے۔ کئی برس پہلے فقط ایک بار کراچی میں سرسری سی ملاقات ہوئی تھی لیکن انہوں نے آتے ہی بڑے بے تکلفانہ اور مربیانہ انداز میں گلہ شروع کر دیا۔ "بھائی صاحب! یہ آپ نے کیا غضب کیا؟ بڑے صاحب کو اس قدر ناراض کر دیا۔ ہم نے تو آپ سے بہت کچھ کام لینا ہے۔ آپ کے لیے ہم نے ایک نہایت اہم پوسٹنگ سوچ رکھی تھی۔ خیر اب بھی وقت ہے' ہم ہر قسم کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔"

علوی صاحب کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ میں حکومت پاکستان کا نہیں بلکہ اسٹینڈرڈ بنک کا ملازم ہوں۔ ان کی باتوں سے یہ اعتماد بھی ٹپکتا تھا' کہ حکومت کا کچھ کاروبار اب غالباً سٹینڈرڈ بنک کے اشاروں پر چلا کرے گا۔ میں نے کسی قدر رکھائی سے علوی صاحب کو ٹال دیا کہ وہ میری ملازمت اور پوسٹنگ کے بارے میں فکر مند نہ ہوں۔ میں یہ معاملات خود ہی طے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔

اس کے بعد غالباً دو بار پھر یحییٰ خاں کے ساتھ میرا آمنا سامنا ہوا۔ ہر بار کی ملاقات پہلے سے بھی زیادہ ناخوشگوار ثابت ہوئی۔ اس کے وجود کی ساری نحوست اور کثافت سنڈاس کی بدرو کی طرح اس کے روئیں روئیں سے بے برکتی کی سڑاند چھوڑتی تھی۔ میجر جنرل پیر زادہ کی بیساکھیوں کا سہارا لے کر جب وہ سربراہ مملکت کی کرسی پر متمکن ہوا تو ایوان صدر کی ہر دیوار پر نوشتہ تقدیر کی صورت میں ذلت اور تخریب کے اٹل اور ناگزیر کتبے آویزاں ہو گئے۔ میرے لیے وہ ساعت نیک تھی۔ جب ایک روز میں نے اچانک ائیر مارشل نور خاں سے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر

For more books visit www.4Urdu.com

اب زندگی کے بقیہ ایام لکھنے پڑھنے میں صرف کروں۔ میرا خیال ہے کہ میرا یہ ارادہ سن کر ائیر مارشل نور خاں کی طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ اور یہ خبر ان کے چہرے پر یوں لگی جیسے ڈاک خانے کی مہر لفافے کے ٹکٹ پر ثبت ہوتی ہے۔

انہی دنوں پیرس میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا ایک اجلاس منعقد ہونے والا تھا۔ چند ماہ پیشتر میں اس بورڈ کا رکن منتخب ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں یونیسکو ایگزیکٹو بورڈ کے ممبر اپنی ذاتی حیثیت سے منتخب ہوا کرتے تھے۔ اس میٹنگ میں شامل ہونے کے لیے میں نے رخت سفر باندھا' تو میجر جنرل پیر زادہ نے کئی طرح کی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی ہر کوشش ناکام رہی۔ پیرس پہنچ کر میں نے خاموشی سے عفت اور ثاقب کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ اور جنرل یحییٰ کو سی ایس پی سے اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔ میرا خیال تھا کہ میرا استعفیٰ چشم زدن میں منظور ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا' ہر کوئی اپنے اپنے اقتدار اور غرور کے گھوڑے پر چڑھا بیٹھا اس بات کا منتظر تھا کہ پہلے میں واپس آ کر ان کے حضور میں سر تسلیم خم کروں تو اس کے بعد وہ میرے استعفیٰ پر غور فرمائیں گے۔ یہ ان کی ناجائز ہٹ دھرمی تھی۔ میں ان سے کچھ مانگ تو نہیں رہا تھا۔ بلکہ اپنی ملازمت کے آٹھ نو سال برضاء و رغبت چھوڑ رہا تھا۔ اس لیے میں نے ان کی یہ طفلانہ ضد ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

خدا خدا کر کے ایک برس کی کشاکشی اور ضدا ضدی کے بعد میرا استعفیٰ تو منظور ہو گیا لیکن میری پنشن تین برس تک بند رہی۔ تین برس کے بعد مجھے پنشن اس وقت ملنا شروع ہوئی۔ جب ملک کو ایک عظیم تباہی اور ذلت کے کنوئیں میں گرا کر یحییٰ خاں اور پیر زادہ ایوان صدر سے نکل بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ طویل عرصہ ہم نے انگلستان کے کئی چھوٹے چھوٹے دیہات میں رہ کر بسر کیا۔ ہر سال اپریل اور اکتوبر کے مہینوں میں پیرس میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا اجلاس منعقد ہوا کرتا تھا۔ ہر اجلاس چار سے پانچ ہفتے تک جاری رہتا تھا۔ وہاں پر کسی نہ کسی طرح تنگی ترشی سے گزارہ کر کے میں

For more books visit www.4Urdu.com

اپنے روزانہ الاؤنس کا کچھ حصہ بچا لاتا تھا۔ اور واپس آ کر رقم عفت کے حوالے کر دیتا تھا۔ جس سے وہ اگلے چھ ماہ تک گھر کا کاروبار چلاتی تھی۔ ان تھوڑے سے پیسوں میں وہ گھر بھی سنبھالتی تھی اور آنے جانے والے مہمانوں کو بھی کسی نہ کسی طرح بھگتاتی رہتی تھی۔ ثاقب کی عمر ان دنوں آٹھ برس کے قریب تھی۔ سکول آنے جانے کے لیے عفت ہر صبح اسے بس کا کرایہ دیا کرتی تھی۔ ایک روز باد و باراں اور برفباری کا شدید طوفان تھا۔ جب سکول بند ہونے کا وقت ہوا تو میں بس اسٹاپ پر جا کھڑا ہوا تا کہ ثاقب کو اپنے ساتھ حفاظت سے گھر لے آؤں۔ کئی بسیں گزر گئیں۔ لیکن ثاقب کسی بس سے نہ اترا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ دور فٹ پاتھ پر وہ افتاں و خیزاں طوفان کے تھپیڑوں میں لڑھکتا ہوا پیدل چلا آ رہا ہے۔ تیز و تند آندھی میں پھسل پھسل کر گرنے سے اس کے دونوں گھٹنے زخمی ہو گئے تھے۔ جن سے خون رس رس کر بہہ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ بس میں کیوں نہیں سوار ہوا؟ اس نے جواب دیا کہ وہ ہر روز سکول سے پیدل ہی آیا کرتا ہے اور بس کا کرایہ بچا کر ہر ہفتے بچوں کا ایک پسندیدہ رسالہ خرید لیتا ہے۔ میں نے عفت کو یہ بات بتائی' تو لمحہ بھر کے لیے تو خوش ہوی لیکن پھر بے اختیار رو پڑی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ تھوڑے سے پیسوں میں پورا گھر چلانا عفت کی کوئی خاص مہارت تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ عقدہ کھلا کہ وہ مجھے اور ثاقب کو اور ہمارے مہمانوں کو خوب کھلاتی پلاتی رہتی تھی۔ لیکن مشرق کی روایتی خواتین کی طرح اپنی ذات پر شدید نف کشی اور ایثار سے کام لیتی رہی تھی۔ یہ راز مجھ پر یوں افشا ہوا کہ اچانک اس کی صحت گرنے لگی۔ میں نے ہسپتال جا کر اس کا طبی معائنہ کرایا تو معلوم ہوا کہ اس کے گردوں کا نظام بری طرح بگڑ گیا ہے۔ پے در پے آپریشنوں کی وجہ سے اس کے گردے پہلے ہی سے کمزوری کی زد میں غیر محفوظ تھے لیکن اب ڈاکٹروں کی تشخیص تھی کہ مرض کی پیچیدگی غذا کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

For more books visit www.4Urdu.com

میرا معمول تھا کہ یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کی میٹنگوں میں شامل ہونے کے لیے میں ہمیشہ لندن اور پیرس کے درمیان پی آئی اے سے سفر کیا کرتا تھا۔ غریب الوطنی میں یہ چھوٹا سا سفر بڑا تسکین بخش ثابت ہوتا تھا۔ ایک روز میں پکیڈلی اسٹریٹ میں پی آئی اے کے دفتر اپنا ٹکٹ بنوانے گیا۔ کاؤنٹر پر کام کرنے والی لڑکی کے پاس اس کی ایک سہیلی بھی بیٹھی تھی' جو ائیر ہوسٹس کی وردی میں ملبوس تھی۔ جب میں نے اپنا نام لکھوایا تو ائیر ہوسٹس چونک کر میری طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔ "میں کچھ عرصہ عفت کی ہم محلّہ رہی ہوں۔ آپ سے آج پہلی بار ملاقات ہوئی ہے۔ اب ٹکٹ تو بعد میں بنوائیں' پہلے مجھے چائے پلائیں۔"

یہ کہتے ہی وہ کاؤنٹر سے اٹھ کر میری طرف آ گئی اور کہنے لگی۔ "آپ ہرگز نہ سوچیں کہ میں کوئی فارورڈ قسم کی لڑکی ہوں۔ جو مان نہ مان میں تیرا مہمان بن کر ہر کسی کے ساتھ چائے پینے اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ دراصل میں آپ کو ایک ضروری بات بتانا چاہتی ہوں۔"

باہر نکل کر ہم ایک قریبی کافی ہاؤس میں جا بیٹھے۔ وہاں پر اس نے مجھے بتایا کہ چند ہفتے قبل وہ اسلام آباد سے کراچی والی فلائٹ پر اپنی ڈیوٹی ادا کر رہی تھی۔ اسی فلائٹ میں یحییٰ خاں اور چند سینئر افسر بھی سفر کر رہے تھے۔ پرواز کے دوران اس نے یحییٰ خاں کو ایک سینئر پولس افسر پر گرجتے برستے سنا کہ قدرت اللہ شہاب کو واپس لا کر اب تک ان کے حضور پیش کیوں نہیں کیا گیا۔ یحییٰ خاں نے پولیس افسر کو دھمکی دی کہ اگر اس حکم کی تعمیل میں مزید تاخیر ہوئی تو وہ اس افسر کی چمڑی اتار دیں گے۔

اتنی بات بتا کر لڑکی نے مجھے مشورہ دیا کہ مناسب یہی ہے کہ میں لندن اور پیرس کے درمیان پی آئی اے کا سفر کرنے کا خطرہ مول نہ لوں۔ اس نے اپنا نام بتانے سے انکار کر دیا اور یہ کہہ کر پی آئی اے کے دفتر واپس چلی گئی کہ "اگر عفت کو کوپر روڈ پر اپنی کوئی ہمسایہ سہیلی یاد ہے' تو وہ شاید مجھے پہچان جائے۔"

For more books visit www.4Urdu.com

گھر آ کر میں نے عفت کو یہ واقعہ سنایا۔ اس نے اپنی بہت سی ہمسایہ سہیلیوں کے نام اور حلئے بتائے لیکن ہماری یہ فرشتہ رحمت ہمیشہ گمنام ہی رہی۔

URDU4U.COM

جس چھوٹے سے گاؤں میں ہم رہتے تھے' وہاں سے کچھ فاصلے پر جلنگھم کا بارونق شہر تھا۔ اس کی ہائی اسٹریٹ میں خود کار واشنگ مشینوں والی ایک لانڈری تھی۔ میں ہر پیر کے روز میلے کپڑوں کا ایک بنڈل وہاں لے جا کر دھو لایا کرتا تھا۔ ایک دن میں لانڈری پہنچا تو باہر فٹ پاتھ پر بڑی بڑی مونچھوں والا ایک لمبا تڑنگا پاکستانی جناح کیپ اوڑھے کھڑا تھا۔ اس نے زور سے کھنکار کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر اپنا ادھ بجھا سگریٹ میرے کندھے پر پھینک کر پنجابی زبان میں بولا۔ "ارے دھوبی کے بچے' کپڑے مشین میں ڈال کر باہر آؤ۔ تمہارے ساتھ باتیں کرنی ہیں۔

یہ شخص میرے لیے قطعی اجنبی تھا۔ اس کی بے تکلفی کے انداز میں ایک خوفناک جارحیت کا عزم جھلک رہا تھا۔ مجھے فوراً ایئر ہوسٹس کی بات یاد آ گئی۔ لانڈری کی دیکھ بھال کرنے والی خاتون مجھے جانتی تھی۔ مشین میں کپڑے ڈالتے ہوئے میں نے اس کو بتایا' کہ باہر فٹ پاتھ پر جو شخص منڈلا رہا ہے غالباً وہ یہاں پر میرے خلاف کوئی واردات کرنے آیا ہے' تم فوراً پولیس کو ٹیلیفون پر خبردار کر دو۔

میں لانڈری سے باہر آیا' تو وہ شخص لپک کر مجھ سے بغل گیر ہوا۔ میں نے پوچھا۔ آپ کی تعریف؟

اس نے دو چار مغلظات سنا کر کہا۔ "میری تعریف باتوں سے نہیں بلکہ ہاتھوں اور لاتوں سے ہو گی۔"

اس نے دوستانہ طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور کہا۔ "بیٹا! اب سے تم میرے قبضہ میں ہو۔ اب کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا۔ کسی کی جانب کوئی اشارہ نہ کرنا۔ جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کرنا۔ ورنہ یاد رکھو ہمارا ایک آدمی تمہارے گھر کے اندر متعین ہے۔ دوسرا آدمی سکول کے باہر بیٹھا تمہارے بیٹے کا انتظار

For more books visit www.4Urdu.com

کر رہا ہے۔ ہم رحمدلی سے کام لے رہے ہیں۔ ہماری بے رحمی کو بیدار کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھنا۔"

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

URDU4U.COM

"میرے ساتھ ابھی اپنے گھر چلو۔ اپنا پاسپورٹ اور سامان اٹھاؤ۔ آج شام کی پرواز سے کراچی روانہ ہونا ہے۔"

میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ تو اس نے پھر چند مغلظات بک کر کہا۔ "دیکھو اب کوئی چالبازی نہ سوچنا۔ ورنہ ہم آج شام کو تمہاری بیوی اور بچے کو اپنے ساتھ لے کر کراچی میں چل دیں گے پھر تم خود ہی سر کے بل ان کے پیچھے آؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے منظور ہے' میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ آؤ اب گھر چلیں۔"

"گھر کیسے چلیں؟" اس نے بگڑ کر کہا۔ "تم اس شہر سے واقف ہو۔ ایک ٹیکسی منگاؤ۔"

میں نے اسے بتایا کہ یہاں پر ٹیکسی ٹیلیفون کر کے ہی منگوائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ہم دونوں لانڈری کے اندر گئے۔ لانڈری والی خاتون کو میں نے اپنا ایڈریس دیا اور درخواست کی کہ وہ ٹیلیفون کر کے ایک ٹیکسی بلا دے جو ہمیں اس ایڈریس پر پہنچا آئے۔ خاتون نے ٹیلیفون کرنے کے بعد بتایا کہ ٹیکسی پانچ سات منٹ میں آ جائے گی۔

ہم دونوں باہر آ کر فٹ پاتھ پر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے ہی ہوئے تھے کہ ایک پولیس کار لانڈری کے عین سامنے آ کر رک گئی۔ اس میں تین باوردی پولیس کانسٹیبل سوار تھے۔ ان میں سے ایک کار سے اتر کر اندر لانڈری میں چلا گیا۔ انہیں دیکھ کر میرا پاکستانی ساتھی شدید گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا اور بولا۔ "یہ حرامی یہاں کیا لینے آئے ہیں؟"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "ان کے کپڑے بھی میلے ہو جاتے ہوں گے' شاید دھلوانے آئے ہوں۔"

چند منٹ بعد ہماری ٹیکسی آ گئی اور ہم دونوں اس میں سوار ہو کر گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ گھر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ایک اسی وضع قطع کا لمبا تڑنگا پاکستانی کالے

For more books visit www.4Urdu.com

رنگ کی جناح کیپ پہنے ہمارے ڈرائنگ روم میں بیٹھا چائے پی رہا ہے۔ عفت کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑا ہوا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھے بتایا کہ ان لوگوں کا ایک ساتھی ثاقب کے سکول کے باہر بھی اس کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ لانڈری والی وہی پولیس کار ہمارے گھر کے سامنے آ کر رکی۔ دو کانسٹیبل گھنٹی بجا کر ہمارے گھر میں داخل ہوئے تو عفت نے واویلا مچایا کہ ان غنڈوں کا ایک ساتھی ہمارے بیٹے کی تاک میں اس کے سکول کے باہر بیٹھا ہے۔ یہ سنتے ہی تیسرے کانسٹیبل نے عفت کو اپنے ساتھ پولیس کار میں بٹھایا اور چند منٹ بعد وہ سکول کے باہر منڈلاتے ہوئے ایک مشٹنڈے کو جو کالی جناح کیپ پہنے تھا' اپنے ساتھ ہمارے ہاں لے آئے۔

ایک کانسٹیبل نے میرے اور عفت کے بیانات لکھے۔ دوسرے نے پاکستانیوں کے کاغذات اور شناختی کارڈ وغیرہ دیکھ کر کچھ خانہ پری کی اور پھر وہ تینوں پاکستانیوں کو اپنے ساتھ لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اسی شام وہی تینوں انگریز پولیس کانسٹیبل پھر ہمارے ہاں آئے۔ انہوں نے معذرت کی کہ ان کے علاقے میں ہمارے ساتھ ایسا ناخوشگوار سانحہ پیش آیا۔ اور ساتھ ہی ہمیں یقین دلایا کہ ہم مطمئن رہیں کہ اب دوبارہ اس قسم کا کوئی واقعہ رونما نہ ہو گا۔

لیکن ان کی اس یقین دہانی نے عفت پر کوئی اثر نہ کیا۔ اس واقعہ نے اس کے دل کا سکون مکمل طور پر چھین لیا۔ وہ رات کو بار بار اٹھ کر ثاقب کو دیکھتی تھی کہ وہ صحیح سلامت اپنے بستر پر موجود ہے یا نہیں۔ جتنا عرصہ وہ سکول میں رہتا تھا وہ قریب کی لائبریری میں بیٹھ کر یہ جائزہ لیتی رہتی تھی کہ سکول کے آس پاس کوئی مشتبہ شخص منڈلا تو نہیں رہا۔ چند ہی روز میں اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایمن آباد والی چندراوتی کی طرح عفت کے بدن کا کندن بھی سنار کی کٹھالی میں پگھل پگھل کر ریزہ ریزہ ہو رہا ہے۔ میں اسے پھر

For more books visit www.4Urdu.com

ہسپتال لے گیا۔ طویل معائنہ کے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ان کا مشورہ تھا کہ میں اسے امریکہ لے جاؤں۔ جہاں ان دنوں اس مرض کے کچھ کامیاب آپریشن ہوئے تھے۔

URDU4U .COM

میں نے جنرل یحییٰ خاں کو کئی خط لکھے اور تاریں بھیجیں کہ میری اپنی تنخواہ سے کاٹا ہوا پراویڈنٹ فنڈ حکومت کے پاس جمع ہے' مجھے وہ فوراً ادا کر دیا جائے تا کہ میں اپنی بیوی کا علاج کروانے کے قابل ہو سکوں۔ لیکن جواب ندارد۔

استعفیٰ دینے کے تین برس بعد جب مجھے میری پنشن ملنا شروع ہوئی اور میرا پراویڈنٹ فنڈ ادا ہوا تو اس وقت تک عفت کا مرض لا علاج ہو چکا تھا۔

انگلستان میں یہ تین برس میرے لیے بڑے سبق آموز ثابت ہوئے۔ بنی نوع انسان کی طوطا چشمی کے علاوہ اس کی مروت' رواداری اور خلوص کا بیک وقت خوب تجربہ ہوا۔ خاص طور پر لندن میں پاکستانی سفارت خانے میں جب یہ خبر پھیلی کہ یحییٰ خاں کی ناراضگی مول لے کر میں نے استعفیٰ دے دیا ہے تو ایمبیسی کے اسٹاف کی اکثریت میرے سائے سے بھی دور بھاگنے لگی۔ ان میں کچھ افسر ایسے بھی تھے' ماضی میں جن کی میں نے کچھ نہ کچھ مدد کی تھی۔ البتہ سفارت خانے میں ایجوکیشن کونسلر تنویر احمد خان کا رویہ ان سب سے مختلف تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے برملا ملتے تھے۔ جب کبھی میں لندن آتا تھا۔ تو تنویر ہر بار اپنی کار میں مجھے وکٹوریہ ریلوے اسٹیشن سے لے جاتے تھے۔ بلا خوف مجھے اپنے دفتر میں بٹھاتے تھے اور شب بسری کے لیے اپنے ہاں لے جاتے تھے۔ گھر آ کر وہ اور ان کی بیگم رشیدہ اپنا کمرہ (Master Bed Room) مجھے دے دیتے تھے۔ اور میاں بیوی دونوں اپنے بچوں کے چھوٹے کمرے میں جا کر سو رہتے تھے۔ میں بار بار احتجاج کرتا تھا کہ میری خاطر وہ اس قدر تکلیف نہ اٹھایا کریں۔ لیکن انہوں نے اپنا یہ معمول کبھی ترک نہیں کیا۔ سفارت خانے کے چند بڑے افسروں نے انہیں کئی بار مشورہ دیا کہ وہ میرے ساتھ اس طرح بر سر عام میل جول نہ رکھیں۔ لیکن تنویر صاحب نے اس طرح کے مشوروں اور انتباہ پر کبھی کان نہ دھرا۔ ان کی اس شفقت

For more books visit www.4Urdu.com

اور حسن سلوک کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ آج کل وہ بنگلہ دیش میں ہمارے سفیر ہیں۔ خدا انہیں مزید ترقیاں عطا فرمائے۔

URDU4U.COM

میرے دوست اور رفیق کار محمد سرفراز کے برادر کبیر نسیم غور کی یاد بھی میرے دل میں زندگی بھر تازہ رہے گی۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں' جن کا وسیع کاروبار ہندوستان' پاکستان' جرمنی اور انگلستان میں پھیلا ہوا تھا۔ لندن کے مضافات سٹن (Sutton) میں ان کا ایک خوبصورت اور شاندار فلیٹ ہے۔ لندن میں پہنچتے ہی انہوں نے اپنا فلیٹ ہمارے حوالے کر دیا۔ جس میں ہم کئی ماہ رہے۔ بعد ازاں ہم پہلے نوٹنگھم اور پھر جلنگھم کے قریب وگمور نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں منتقل ہو گئے وہاں پر نسیم غور نے ہمیں ایک چھوٹا سا مکان خریدنے کے لیے چھ ہزار پونڈ کی خطیر رقم قرض حسنہ کے طور پر دے دی۔ اس رقم کی انہوں نے کوئی رسید تک نہ لی۔ ۱۹۷۲ء میں یحییٰ خاں کی معزولی کے بعد جب ہم پاکستان آنے لگے تو یہ مکان ہم نے بیچ دیا۔ اس وقت تک ہر چیز کی قیمت بڑھ چکی تھی۔ اس لیے اس مکان کی قیمت فروخت اس کی قیمت خرید سے زیادہ ملی۔ لیکن نسیم غور نے اپنے قرض حسنہ کے فقط چھ ہزار پونڈ ہی واپس لینا منظور کیا۔

نسیم غور باغ بہار طبیعت کے آدمی ہیں۔ شگفتہ دلی' بذلہ سنجی اور خوش اخلاقی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ جب کبھی وہ لندن آتے تھے تو وگمور سے ہمیں اپنی کار میں بٹھا کر اپنے سٹن والے فلیٹ میں لے جاتے تھے۔ انواع و اقسام کے پاکستانی کھانے پکانے میں انہیں خاص مہارت تھی۔ بارہا انہوں نے ہمیں اپنے ہاتھوں سے بڑے لذیذ کھانے پکا کر کھلائے۔ ثاقب سے وہ بے حد پیار کرتے تھے۔ ثاقب بھی آج تک ان کا گرویدہ ہے۔

اسی زمانے میں راجہ صاحب محمود آباد بھی لندن میں مقیم تھے۔ وہ ریجنٹ پارک والی مسجد کمیٹی کے ڈائریکٹر تھے اور وہیں پر بالائی منزل کے چند کمروں میں رہتے تھے۔ انہوں نے ہمیں کئی بار اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا۔ نوابی طرز کے خوش ذائقہ کھانے وہ خود

For more books visit www.4Urdu.com

پکایا کرتے تھے۔ ایک روز عفت نے انہیں باورچی خانے میں ہانڈیاں پکاتے ہوئے دیکھا تو اس کے آنسو آ گئے کہ اتنا بڑا رئیس اور تحریک پاکستان کا ممتاز کارکن خود باورچی خانے میں کام کر رہا ہے۔ وفات تک انہوں نے ہمارے ساتھ شفقت اور محبت ہی کا برتاؤ روا رکھا ہے۔

URDU4U.COM

اس طرح کی روشن مثالوں کے برعکس لندن میں پاکستانی سفارت خانے کے ایک ذمہ دار افسر کا رویہ بھی قابل ذکر ہے۔ ان حضرت کو میں لاہور میں ایک معمولی سے عہدے سے اٹھا کر ایوان صدر میں لے آیا تھا۔ ترقی پر ترقی کرتے وہ لندن میں ہمارے سفارت خانے کے ایک اہم شعبے کے سربراہ بن گئے۔ جب تک میں ملازمت میں رہا وہ اور ان کی بیگم صاحبہ وقت بے وقت میری اتنی خوشامد اور خاطر تواضع کرتے تھے کہ مجھے الجھن اور پریشانی محسوس ہونے لگتی تھی۔ لیکن جونہی میں نے ملازمت سے استعفیٰ دیا انہوں نے یکایک اپنی آنکھیں پھیر لیں۔ پورے تین برس انہوں نے میرے ساتھ ٹیلیفون پر بھی بات تک نہ کی۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً لندن کے اردو اخبارات اور پاکستان میں ایک دو اخباروں میں میرے خلاف من گھڑت خبریں بھی آنا شروع ہو گئیں۔ ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ میرے خلاف ہر خبر چھپوانے کے لیے پانچ سے دس پونڈ تک معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔ مجھے شک ہے کہ یہ مہم انہی حضرت کی سرکردگی میں چل رہی تھی۔ واللہ اعلم اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔

تیری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایت زمانہ

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• یونیسکو

پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا میں امن و امان کو فروغ دینے کے لیے لیگ آف نیشنز وجود میں آئی تھی' لیکن یہ انجمن کفن چوروں کی جماعت ثابت ہوئی اور اقوام عالم کی بہت سی قبریں آپس میں تقسیم کرنے کے بعد اس نے آرام سے جنیوا میں دم توڑ دیا۔

URDU4U.COM

دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ کی تنظیم نو' یو این او نے جنم لیا۔ اس ادارے کا رہنما اصول جس کی لاٹھی اس کی بھینس ہے۔ جب کوئی لاٹھی والا طاقتور ملک جارحیت سے کام لے کر کسی چھوٹے اور کمزور ملک کی بھینس زبردستی ہنکا کر لے جاتا ہے تو یو این او فوراً جنگ بندی کا اعلان کر کے فریقین کے درمیان سیز فائر لائن کھینچ دیتی ہے۔ جنگ بندی کے خط پر یو این او کی نامزد فوج اور مبصر متعین ہو جاتے ہیں۔ جو اس بات کی خاص نگہداشت رکھتے ہیں کہ مسروقہ بھینس دوبارہ اپنے ملک کے پاس واپس نہ پہنچنے پائے۔ اس کے بعد یہ سارا معاملہ جنرل اسمبلی اور سکیورٹی کونسل کی قرار دادوں میں ڈھل ڈھل کر نہایت پابندی کے ساتھ یو این او کے سرد خانوں میں جمع ہوتا رہتا ہے۔

نیویارک میں جگہ کی کمیابی کے باعث مختلف شعبوں کے اپنے اپنے سرد خانے یو این او کے دم چھلا بین الاقوامی اداروں کے نام سے بہت سے دوسرے یورپی ممالک میں قائم ہیں۔ غالباً سیاسی گرد و غبار' موسمیاتی تپش و حرارت اور ناخواندگی و افلاس کی گرم بازاری کے پیش نظر مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید سمیت کسی افریقی اور ایشیائی ملک کو اقوام متحدہ کے کسی بڑے ذیلی ادارے سے نہیں نوازا گیا۔ البتہ ابھی حال ہی میں Prog کے متعلق ایک بین الاقوامی ادارہ نیروبی میں قائم ہوا ہے۔ جس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ وہ عین خط استوا کے قریب واقع ہے۔

اقوام عالم میں تعلیم' سائنس اور ثقافت کی ترقی و تعمیر و ترویج کے لیے یو این او کا جو

For more books visit www.4Urdu.com

ادارہ پیرس میں قائم ہے اس کا نام یونیسکو (UNESCO) ہے۔

(United Nation's Education, Science and Culture Organization)

اس کا ایک خاص طرۂ امتیاز یہ ہے کہ یہ ادارہ اپنے بجٹ کا تقریباً دو تہائی حصہ پیرس میں متعین اپنے ہیڈ کوارٹر اسٹاف پر صرف کرتا ہے اور باقی ایک تہائی حصہ ساری دنیا میں تعلیم' سائنس اور ثقافت کے فروغ پر لگاتا ہے۔ یعنی سارے عالم میں تیس روپے کے تعلیمی سائنسی اور ثقافتی پروگراموں پر عمل درآمد کے لیے یونیسکو کا ہیڈ کوارٹر پیرس میں بیٹھے ہوئے اسٹاف پر ستر روپے خرچ کرتا ہے۔

شروع میں یونیسکو کا ہیڈ کوارٹر ایک پانچ منزلہ عمارت میں سمایا ہوا تھا۔ جوں جوں یونیسکو کا بجٹ بڑھتا گیا' اسی رفتار سے اس کے عملے میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نوبت بہ ایں جا رسید کہ ایک دوسری عمارت بھی تعمیر ہوئے جس کی بلندی گیارہ منزلہ ہے۔ سنا ہے کہ بتدریج بڑھتے ہوئے اسٹاف کی ضروریات کے لیے یہ دو عمارتیں بھی اب ناکافی ثابت ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ مضافات میں ایک نہایت خوبصورت محل نما وسیع و عریض بنگلہ بھی ہے جو خاص الخاص لوگوں کے لیے مناسب اوقات پر عیش و نشاط فراہم کرنے کے کام آتا ہے۔

یونیسکو کی یہ ترقی معکوس اس کے ایک فرانسیسی ڈائریکٹر جنرل موسیو رینے ماہیو کے زمانے میں ہوئی۔ یہ صاحب نیچے درجے کی اسامیوں سے ترقی کرتے کرتے اس عہدہ جلیلہ پر پہنچے تھے اور پورے بارہ برس تک یونیسکو کے سیاہ و سفید پر چھائے رہے۔

یو این او کے دیگر بین الاقوامی اداروں کی طرح یونیسکو کی خود مختاری ہر نوعیت کے احتساب سے بالا تر ہے۔ رینے ماہیو جیسا کائیاں ڈائریکٹر جنرل یونیسکو میں دونوں سپر پاورز کی ترازو کے پلڑے قریباً قریباً ہم وزن رکھتا تھا۔ دوسرے ممالک کے نمائندے اگر کسی موضوع پر کوئی حرف شکایت زبان پر لاتے تھے تو ان کا منہ بند کرنے کے لیے سیکرٹریٹ میں ملازمتوں کی رشوت فوراً کام آتی تھی۔ کچھ لوگ دنیا بھر میں سفر کرنے والے کمشنوں اور کمیٹیوں میں شمولیت پر ہی آسانی سے ٹرخا دیئے جاتے تھے۔ بعض لوگوں کی قیمت صرف

For more books visit www.4Urdu.com

اتنی تھی کہ وہ وقتہ فوقتہ یونیسکو کے خرچ پر پیرس آتے جاتے رہیں۔ ان حربوں سے ہر طرح کی تنقید و تنفیص کا راستہ بند کرنے کے بعد جنرل کانفرنس اور ایگزیکٹو بورڈ کا کوئی اجلاس ڈائریکٹر جنرل کا بال تک بیکا نہ کر سکتا تھا۔

URDU4U.COM

خود حفاظتی کا یہ حصار کھینچ کر موسیو رینے ماہیو نے بارہ برس تک یونیسکو میں اپنی اندر سبھا قائم کئے رکھی۔ ان کا زمانہ اخلاقی اقدار کی پامالی نا انصافی' خویش پروری اور جنسی بے راہروی کا دور تھا۔ انہوں نے اپنی ایک داشتہ کو اپنے ذاتی عملے میں ایک بڑی اسامی پر مامور کر رکھا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرا بہت سا اسٹاف بھی اسی دوش پر چل نکلا۔

جب میں پہلی بار یونیسکو کی جنرل کانفرنس میں شریک ہونے پیرس گیا' تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دفتر کے بہت سے کابک نما کمروں میں ایک ایک مرد کے سامنے ایک ایک عورت سج دھج کر بیٹھی ہے اور دونوں ٹکٹکی باندھے ایک دوسرے کی جانب ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق لگاتار دیکھ رہے ہیں۔ یونیسکو کی غلام گردشوں میں گھومتے پھرتے یہ بھی نظر آیا کہ کہیں کہیں یہ جوڑے اسی محویت کے عالم میں سارا سارا دن آمنے سامنے گلدانوں کی طرح سجے رہتے تھے۔ اس زمانے میں یہ دستور عام تھا کہ یونیسکو کے کئی منچلے انٹرنیشنل سول سرونٹ اپنی محبوباؤں کو سیکرٹری کے طور پر بھرتی کر کے اپنے دفتر کے کمرے کی زینت بنا لیتے تھے۔ انہی دنوں فرانس میں ایک اسٹیج ڈرامہ انتہائی مقبول ہو رہا تھا جس کا موضوع پیرس کی سڑکوں پر ٹریفک کے ہجوم کی وجہ سے مرد حضرات کی بے بسی اور بے چارگی تھا۔ ڈرامے کا مرکزی کردار ایک بین الاقوامی ادارے (غالباً یونیسکو) کا ملازم تھا جس کی ایک بیوی گھر میں منتظر ہوتی تھی۔ ایک داشتہ کو دفتر سے گھر پہنچانا ہوتا تھا اور اس کے بعد پیرس کے مضافات میں دوسری داشتہ سے ملنے کے لیے جانا بھی ہر روز لازمی تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک جام اس مظلوم عاشق مزاج بین الاقوامی سول سرونٹ کے پروگرام کو اس قدر درہم برہم کر دیتا تھا کہ اس کی زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی جاتی تھی۔ جس میں شیرینی گھولنے کے لیے یونیسکو کا بجٹ

For more books visit www.4Urdu.com

ہر سال اس کی تنخواہ اور دیگر مراعات میں خاطر خواہ اضافہ کرتا رہتا تھا۔ جس طرح ڈائریکٹر جنرل اپنی من مانیاں کرنے میں مختار کل تھا' اسی طرح اس کا منظور نظر عملہ بھی اپنے ماتحتوں پر ہر طرح کی مشق ناز آزمانے میں آزاد تھا۔ لیکن فرعونے رامو سے' رینے ماہیو کی فرعونیت کا طلسم توڑنے کے لیے یونیسکو میں احتجاج اور مزاحمت کی جو آواز اٹھی۔ وہ ایک پاکستانی کے مقدر میں لکھی تھی۔ ان کا نام نسیم انور بیگ ہے۔

نسیم بیگ گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک ممتاز طالب علم تھے۔ وہ اپنے زمانے کے نہایت نامور مقرر تھے اور طلباء کے آل انڈیا مباحثوں میں حصہ لے کر بہت سی ٹرافیاں جیت چکے تھے۔ اکنامکس میں ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے لاہور لاء کالج سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن بھی تھے اور تحریک پاکستان میں طلباء کے کردار کے بارے میں قائداعظم سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمت میں کئی بار حاضر ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں لاہور میں خضر حیات ٹوانہ کی حکومت کے خلاف تحریک میں حصہ لے کر وہ کچھ عرصہ تک جیل میں بھی رہے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ انٹرنیشنل سول سروس میں داخل ہو کر یونیسکو کے ہیڈ کوارٹر میں آ گئے۔ یہاں پر وہ کئی برس متواتر یونیسکو اسٹاف یونین کے صدر منتخب ہوتے رہے۔ ملازمین کے حقوق کی حفاظت کے لیے انہوں نے جس دور اندیشی اور جرات مندی کا مظاہرہ کیا اس کی دھوم یو این او کے تمام بین الاقوامی اداروں میں پھیل گئی اور یونائیٹڈ نیشنز کے تمام اداروں کی یونینوں کی فیڈریشن نے بھی ان کو کافی عرصہ تک اپنا مشترکہ صدر منتخب کئے رکھا۔ اس حیثیت میں نسیم بیگ کا یونیسکو کے آمرانہ ڈائریکٹر جنرل رینے ماہیو کے ساتھ کئی بار شدید ٹکراؤ ہوا۔ اس قسم کے ہر تصادم میں ڈائریکٹر جنرل نے ہمیشہ منہ کی کھائی لیکن ذاتی سطح پر اس نے نسیم بیگ کی ملازمت میں ہر طرح کے رخنے ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ نسیم بیگ صاحب کی ہمت تھی کہ ڈائریکٹر جنرل کی منتقمانہ کارروائیوں کو خاطر میں لائے بغیر وہ اپنے عدل و انصاف

For more books visit www.4Urdu.com

کے موقف پر کامیابی سے ثابت قدم رہے اور یونیسکو میں تیس سالہ بے لوث خدمت کی روایات چھوڑ کر ابھی حال ہی میں وہاں سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

URDU4U.COM

اکتوبر ۱۹۶۸ء میں مجھے پاکستانی وفد کا سربراہ بنا کر یونیسکو کی جنرل کانفرنس میں شرکت کے لیے پیرس بھیجا گیا تھا۔ وہاں پر میں نے یہ چلن دیکھا کہ تقریباً ہر ملک کے وفد کا قائد زبانی کلامی تو ڈائریکٹر جنرل کے خلاف بڑھ چڑھ کر تنقید و تنقیص کرتا ہے۔ لیکن اسٹیج پر آ کر اپنی تقریر میں اس کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر منافقت اور خوشامد کے اس گھٹیا معیار نے ایک بندھی بندھائی رسم کے صورت اختیار کر رکھی تھی۔ ریا کاری کی اس بدعت کو توڑنے کا موقع حسن اتفاق سے میرے ہاتھ آ گیا۔ میں نے اپنی تقریر میں اعداد و شمار اور حقائق و شواہد کو بنیاد بنا کر یونیسکو کی انتظامیہ میں پھیلی ہوئی بد نظمیوں' بد عملیوں' نا انصافیوں' فضول خرچیوں' بد اعتدالیوں اور عیاشیوں کا تفصیل کے ساتھ پردہ چاک کیا۔ یہ باتیں سن کر چند لمحے تو ہال میں گہرا سناٹا چھایا رہا۔ لیکن اس کے بعد زبردست تالیوں کے ساتھ ایک ایک فقرے کی یوں پذیرائی ہوئی جیسے مشاعروں میں اشعار پر داد ملتی ہے۔ ڈائریکٹر جنرل رینے ماہیو بھی اسٹیج پر بیٹھا تھا۔ میری تقریر سن کر وہ اتنا بے چین ہوا کہ اس نے پے در پے اورنج جوس کے چار یا پانچ گلاس نوش کئے اور تقریر ختم ہوتے ہی غیظ و غضب کے عالم میں بھنایا ہوا اٹھ کر چلا گیا۔

اسی جنرل کانفرنس کے دوران ایگزیکٹو بورڈ کی چند خالی نشستوں کے لیے انتخاب بھی منعقد ہونے والا تھا۔ ایک نشست کے لیے انتخاب لڑنے کا میں بھی امیدوار تھا۔ ہندوستان' روس اور امریکہ تینوں میری مخالفت پر کمر بستہ تھے۔ ہندوستان تو صرف اس لیے میرے خلاف تھا کہ میں پاکستانی ہوں' لیکن روس اور امریکہ کے پاس ناراضگی کی یہ مشترکہ وجہ تھی کہ چین کو یونیسکو کا ممبر بنانے کی مہم میں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ اس کے علاوہ امریکہ کو یہ شکایت بھی تھی کہ یروشلم اور مقبوضہ عرب علاقوں میں

For more books visit www.4Urdu.com

اسلامی تاریخ آثار اور اسلامی ثقافت کے نشان کو مسخ کرنے اور مٹانے پر میں اسرائیل کے خلاف شدید احتجاج کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ اب اس پر مستزاد یہ کہ ڈائریکٹر جنرل بھی میری مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے اپنے حواریوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے ایگزیکٹو بورڈ میں آنے سے روکیں۔

مخالفانہ قوتوں کے اس بھاری بھر کم صف آرائی کے مقابلے میں میرا بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر تھا۔ نسیم انور بیگ نے اپنا اثر و رسوخ بھی میرے حق میں بے دریغ استعمال کیا' اور اپنے دفتر کا کمرہ عملی طور پر میری انتخابی مہم کے مرکز میں تبدیل کر دیا۔ پاکستانی وفد کے تین اراکین تنویر احمد خان' عبداللطیف مرحوم اور ڈھاکہ کی بیگم رقیہ کبیر نے دن رات کی محنت اور جانفشانی سے انتہائی مفید کام کیا۔ خوش قسمتی سے انہی دنوں عرب ممالک نے جنرل کانفرنس میں یہ قرار داد پیش کر رکھی تھی کہ یونیسکو میں انگریزی' فرانسیسی' ہسپانوی اور روسی زبانوں کی طرح عربی کو بھی بین الاقوامی زبان کا درجہ دیا جائے۔ امریکہ' برطانیہ اور تمام یورپی ممالک اپنے حواریوں سمیت اس تجویز کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے۔ کسی قدر تیاری اور محنت کے بعد میں نے ہر موقع پر عربی زبان کے حق میں ایسی تقریریں کیں کہ عرب ممالک کے وفود نے مطمئن ہو کر یونیسکو میں اس تحریک کی قیادت میرے اوپر چھوڑ دی۔ ساتھ ہی مجھے معلوم ہوا کہ ہر طرح کے دباؤ اور مخالفت کو نظر انداز کر کے عرب ممالک کا پورا گروپ ایگزیکٹو بورڈ کی الیکشن میں مجھے ووٹ دینے پر رضا مند ہے۔ اسی طرح افریقہ اور لاطینی امریکہ کے گروپوں کی جانب سے بھی یہی اشارے ملے کہ وہ بھی میرے حق میں ووٹ دینے پر متفق ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ایگزیکٹو بورڈ میں وہ ایک ایسا شخص بھیجنا چاہتے تھے جو ڈائریکٹر جنرل کی آمریت اور بد عنوانیوں پر کھل کر بات کر سکے۔ یہ ساری وجوہات اندازے اور قیاس آرائیاں محض طفل تسلیاں تھیں۔ اصل بات صرف یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا اور جب الیکشن ہوا تو میں ۱۱۷ میں سے ۹۱ ووٹ حاصل

For more books visit www.4Urdu.com

کر کے چھ برس کے لیے ایگزیکٹو بورڈ کا ممبر منتخب ہو گیا۔
ایگزیکٹو بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے مجھے یونیسکو کے ظاہر اور باطن کو اچھی طرح کھنگالنے کا موقع نصیب ہوا۔ مجموعی طور پر میں نے اس کا اندر اور باہر کھوکھلا کر دیا۔ گرمئی گفتار اس کی روح اور چھپا ہوا کاغذ اس کا پیرہن ہے۔ اس کی چار دیواریوں میں ہر دوسرے برس تحریری اور تقریری الفاظ کا سیلاب طوفان نوح کی طرح اٹھتا ہے اور نیا بجٹ اور پروگرام منظور ہوتے ہی دفعتہ فرو ہو کر زیر زمین غائب ہو جاتا ہے۔ یونیسکو کی تحریر اور تقریر کی اپنی مخصوص زبان پر اپنا لہجہ اپنی اصطلاح اور اپنا اسلوب ہے۔ اس ادارے کا سب سے نمایاں خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اس کے زیر سایہ تقریباً ڈھائی تین ہزار ملازمین پیرس کے سیکرٹریٹ میں اور تقریباً ڈیڑھ دو ہزار افراد دنیا کے دوسرے حصوں میں اچھی تنخواہوں پر آرام اور سکون کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد نہایت عمدہ پنشن پاتے ہیں۔ یونیسکو کے اسی ایک کام کو غالباً اس کا سب سے بڑا فلاحی اور تعمیری درجہ دیا جا سکتا ہے۔

ایک بار نوجوانوں کے مسائل پر سوچ بچار کرنے کے لیے یونیسکو کے زیر اہتمام پیرس میں ایک سیمینار منعقد ہوا۔ اس میں حصہ لینے کے لیے دنیا بھر سے جو نمائندے مدعو کئے گئے' ان سب کی عمر ساٹھ برس سے اوپر تھی۔ ایگزیکٹو بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے میں بھی اس میں شریک ہوا۔ میری عمر بھی اس وقت ۵۱ برس کے قریب تھی۔ اس کے باوجود میں اس سیمینار کا سب سے کم عمر ڈیلیگیٹ تھا۔ میں نے سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں یہ پوائنٹ آف آرڈر اٹھایا کہ یہ انتہائی غیر نمائندہ اجلاس ہے کیونکہ پچاس ساٹھ برس سے اوپر والی عمر کے لوگ آج کل کی نوجوان نسل کے مسائل سمجھنے اور حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس پر بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ تماشائیوں کی صف سے کچھ نوجوان کود کر ہال میں آ گئے اور انہوں نے الٹی میٹم دیا کہ جب تک نئی نسل کے نمائندوں کو اس سیمینار میں شامل نہیں کیا جاتا' وہ اس اجلاس کی کارروائی کو جاری رہنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ مجبوراً ان کی شرط مانی گئی اور نوجوانوں کی بعض تنظیموں

For more books visit www.4Urdu.com

کے نمائندوں کو بھی سیمینار کے اجلاس میں شامل کیا گیا۔
سیمینار میں ایک مقالہ میں نے بھی پڑھا۔ اس کا ایک حصہ کچھ علمی طبقوں میں کسی قدر
URDU4U.COM
پسند کیا گیا۔ خاص طور پر یورپ میں نوجوانوں کی کئی تنظیموں نے اس کی کئی زبانوں
میں خاصی تشہیر کی۔

یونیسکو کے اسٹاف میں ایک اسامی ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کی بھی تھی۔ ایک بار موسیو رینے ماہیو کے سر پر بھوت سوار ہو گیا کہ اس کے نیچے ایک کی بجائے دو ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ہونا چاہئیں۔ دوسری اضافی اسامی کی نہ کوئی ضرورت تھی' نہ کوئی جواز تھا۔ بات صرف یہ تھی کہ وہ اپنے کسی منظور نظر کو خواہ مخواہ ترقی دے کر اس عہدے پر فائز کرنا چاہتا تھا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کی دوسری اسامی کی منظوری کے خلاف ایگزیکٹو بورڈ میں بڑی لے دے ہوئی۔ رینے ماہیو اس تجویز کو جنرل کونسل میں لے گیا۔ حسن اتفاق سے وہاں پر تقریر کرنے کے لیے پہلے میری باری آئی۔ میں نے انتظامی لحاظ سے اعداد و شمار کا تجزیہ کر کے اس تجویز کی شدید مخالفت کی اور اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی۔

If You have two bottle necks instead of one، does it really double the capacity of the bottle؟ Please answer this question، Mr. Director General!

میری تقریر کا یہ فقرہ چل نکلا۔ میرے بعد بہت سے مندوبین جو اس مسئلہ پر تقریر کرنے آئے ان میں سے ہر ایک نے یہ سوال ضرور دہرایا۔ صبح سے شام تک سارا دن یہ فقرہ سنتے سنتے ڈائریکٹر جنرل کے اعصاب جواب دے گئے اور ووٹ اندازی سے پہلے ہی اس نے اپنی تجویز واپس لے لی۔
فلسطینی مہاجرین کے بچوں کے لیے یونیسکو نے اپنے خرچ پر یروشلم' دریائے اردن کے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں بہت سے سکول کھول رکھے تھے۔ ان سکولوں میں تربیت یافتہ مسلمان اساتذہ بھی یونیسکو کی منظوری سے تعینات ہوتے تھے' اور ان میں جو درسی کتابیں

For more books visit www.4Urdu.com

پڑھائی جاتی تھیں۔ وہ بھی یونیسکو کی جانب سے منظور شدہ ہوتی تھیں' جب یروشلم سمیت ان علاقوں پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا تو رفتہ رفتہ یہ خبریں آنے لگیں کہ اسرائیلی حکومت نے ان سکولوں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ یونیسکو کے متعین کردہ مسلمان اساتذہ کو زبردستی گھر بٹھا دیا گیا ہے۔ ان کو تنخواہ تو باقاعدہ ملتی ہے' لیکن کسی سکول کے قریب تک آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اگر کوئی استاد کسی جگہ حرف شکایت زبان پر لاتا ہے' تو وہ اپنے بال بچوں سمیت ناقابل بیان مظالم اور تشدد کی زد میں آ جاتا ہے۔ ان مسلمان اساتذہ کی جگہ ہر سکول میں اب کٹر یہودی اسٹاف فلسطینی مہاجر بچوں کو پڑھانے پر مامور ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر سکول سے یونیسکو کی منظور شدہ درسی کتابیں بھی نصاب سے خارج کر دی ہیں۔ اور ان کی جگہ اب ایسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن میں اسلام سیرت مبارکہ اور عرب تاریخ و ثقافت کے خلاف انتہائی گمراہ کن' غلیظ اور شرمناک پروپیگنڈا ہوتا ہے۔

ایگزیکٹو بورڈ کے ہر اجلاس میں عرب ممالک کے نمائندے اور اسرائیل کی ان مذموم حرکات کا کچا چٹھا کھولتے تھے اور اپنے ثبوت میں ان کتابوں کے نمونے بھی پیش کرتے تھے جو اس نے یونیسکو کے قائم کردہ سکولوں میں زبردستی رائج کی ہوئی تھیں۔ صحیح حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے دو بار ایک معائنہ ٹیم اسرائیل گئی' لیکن دونوں بار ہمیں یہ رپورٹ ملی کہ عربوں کے الزامات کی تصدیق میں مقامی طور پر کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ ٹیمیں اسرائیلی حکومت کے ساتھ پہلے سے اپنا پروگرام طے کر کے وہاں جاتی تھیں' اور معائنہ کے روز اسرائیلی حکام متعلقہ سکولوں میں یونیسکو کے منظور شدہ اساتذہ اور کتابوں کی نمائش کا ڈرامہ رچا دیتے تھے۔

ایگزیکٹو بورڈ میں عرب نمائندوں کے ساتھ میرے بڑے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔ ہم لوگ آپس میں مل جل کر اکثر ایسی تدبیریں سوچا کرتے تھے جن سے اسرائیل کی اس صریح دھاندلی اور اسلام دشمنی کا بھانڈا پھوڑا جائے۔ کافی سوچ بچار کے بعد سب کی یہی متفقہ

For more books visit www.4Urdu.com

رائے ہوئی کہ کسی قابل اعتماد شخص کو خفیہ مشن پر اسرائیل بھیجا جائے اور وہ وہاں سے اسرائیل کے خلاف عائد کردہ الزامات کا ایسا ثبوت فراہم کرے جو ناقابل تردید ہو۔ کئی ہفتوں کی چھان بین اور بحث مباحثہ کے بعد انجام کار قرعہ فال میرے نام نکلا۔ میں نے بھی اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔ یہ بات نہیں کہ میں جیمز بانڈ کی طرح کسی خطرناک اور سنسنی خیز مہم میں کود کر جان کی بازی لگانے کا شوقین تھا' بلکہ وجہ صرف یہ تھی کہ ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد اس زمانے میں میرے پاس کچھ فالتو وقت تھا۔ اس کے علاوہ میرے دل میں ایک لگن یہ بھی تھی کہ شاید اسی بہانے میرے ہاتھوں ہزاروں فلسطینی بچوں کی کوئی خدمت ہو جائے جو اسرائیل کے قبضہ اختیار میں آ کر ایسی کتابیں پڑھنے پر مجبور تھے۔ جن میں دین اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک پر انتہائی رکیک' بے بنیاد' غلیظ اور گمراہ کن حملے کئے گئے تھے۔ چنانچہ میرا رابطہ ایک خفیہ تنظیم سے قائم ہو گیا۔ چند ہفتے مجھے پیرس' قاہرہ اور بیروت میں زیر تربیت رکھا گیا۔ اس کے بعد ایک جعلی ایرانی پاسپورٹ پر مجھے دس روز کے لیے اسرائیل بھیجنے کا پروگرام طے ہو گیا۔ اس زمانے میں سابق شاہ ایران کی حکومت نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہوا تھا۔

ٹریننگ کے دوران میری سب سے بڑی کمزوری یہ پائی گئی کہ میں اپنا اصلی نام بھلا کر اپنا فرضی ایرانی نام اپنانے میں بار بار چوک جاتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ انسان اپنی ذات کے گنبد میں اتنا اسیر ہوتا ہے کہ اپنے نام کی زنجیر تک سے چھٹکارا پانا محال ہے۔ میری اس کمزوری یا معذوری کو بھانپ کر میرے مددگاروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسرائیل میں قیام کے دوران میں سونے سے قطعاً پرہیز کروں۔ انہوں نے مجھے متنبہ کیا کہ نیند کے دوران یا نیند سے اچانک چونک کر میرے ذہن میں اپنی اصلی اور فرضی نام گڈمڈ ہونے کا شدید احتمال ہے۔ اس لیے خود احتیاطی اور عقل سلیم کا یہی تقاضا ہے کہ میں وہاں پر اپنا تمام وقت عالم بیداری میں ہی گزاروں۔ نیند سے

For more books visit www.4Urdu.com

بچنے کے لیے انہوں نے مجھے ایک خوبصورت سی ڈبیہ (Pillbox) میں کچھ گولیاں دیں۔ پہلے روز ایک گولی' دوسرے روز دو گولیاں' تیسرے روز تین ------- اسی طرح ہر روز ایک گولی بڑھانے سے رات بھر نیند نہ آنے کا قوی امکان تھا۔ ان گولیوں کے علاوہ اس ڈبیہ میں سرخ رنگ کا ایک کیپسول بھی تھا۔ یہ کیپسول دراصل موت کی پڑیا تھی۔ اسے نگلتے ہی انسان آناً فاناً ابدی نیند سو جاتا تھا۔ مجھے حکم تھا کہ اسرائیل میں اگر کسی وقت میرا راز فاش ہوتا ہوا محسوس ہو تو میں فوراً اس کیپسول کو نگل کر جان جان آفریں کے سپرد کر دوں۔ کیونکہ اسرائیلیوں کے ہاتھ آ کر زندہ درگور ہونا انتہائی ذلت اور اذیت کی زندگی کو دعوت دینا تھا۔ اس کے علاوہ زندہ گرفتار ہونا خفیہ تنظیم کے وجود کو بھی خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

ایک روز میں نے تربیت دینے والے ماہرین سے پوچھا کہ اسرائیل سے میرے صحیح سلامت واپس آ جانے کا کتنے فیصد امکان ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایسی مہمات میں عموماً پچاس فیصد کامیابی اور پچاس فیصد ناکامی کا تناسب رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس تناسب کا تمہارے کیس پر اطلاق نہیں ہوتا۔ کیونکہ تمہارے اپنے اصلی نام سے مختلف رسالوں اور اخباروں وغیرہ میں تمہاری تصویریں شائع ہوتی رہی ہیں اس لئے دوسروں کی نسبت تمہارے پکڑے جانے کا خطرہ بہت زیادہ ہے۔

یہ سن کر میری ہمت کا غبارہ اندر سے پچک گیا۔ موت کے خوف سے میرے دل اور دماغ کی گھگھی بندھ گئی۔ دو تین روز میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں دم سادھے یوں بے حس و حرکت پڑا رہا جیسے چڑیا کا بے بال و پر بچہ گھونسلے سے گر کر زمین پر چونچ کھولے سسک رہا ہو۔ خدمت اسلام کا نشہ ہرن ہو گیا اور فلسطینی مہاجر بچوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی خوف و ہراس کے ملبے میں دب کے رہ گیا۔ پورے تین روز میں طرح طرح کے حیلے بہانے تراشتا رہا جنہیں آڑ بنا کر میں کسی طرح اس مہم سے کنارہ کشی اختیار کر لوں لیکن چوتھے روز ایک اتفاقیہ حادثے نے میرے خوفزدہ اور پراگندہ ذہن

For more books visit www.4Urdu.com

کی سوچ کا دھارا بدل دیا۔

میں اپنے ہوٹل سے نکل کر سڑک عبور کرنے کے لیے ایک قریبی ٹریفک لائٹ پر کھڑا تھا۔ جب ہمارے سامنے والی بتی سبز ہوئی تو بہت سے دوسرے راہگیروں کے ساتھ میں نے بھی ایک زیبرا کراسنگ پر سڑک کو پار کرنا شروع کیا۔ عین اس وقت سرخ بتیوں کی جانب سے ایک مرسیڈیز کار اچانک نمودار ہوئی اور نہایت تیز رفتاری سے چار راہگیروں کو کچلتی ہوئی کچھ دور آگے جا کر رک گئی۔ کار کو ایک خاتون چلا رہی تھی جو کسی خطرناک نشے میں مدہوش تھی۔ دو راہگیر تو موقع پر ہی ہمارے سامنے ہلاک ہو گئے۔ باقی دو شدید زخمی ہو کر سڑک پر اوندھے پڑے تھے۔ میں نے حساب لگایا کہ اگر میں دو یا تین فٹ آگے ہوتا' تو یقیناً میرا شمار بھی مرنے والوں میں یا زخمی ہونے والوں میں ہوتا۔ اس المناک جائے وقوعہ پر دو لاشوں اور دو قریب المرگ ڈھانچوں کے درمیان کھڑے کھڑے میرے منطق گزیدہ دماغ کو زندگی میں پہلی بار اس بات کا یقین آ گیا کہ اگر موت مقدر میں ہے تو اسرائیل جانے یا نہ جانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں' بلکہ یہاں پیرس میں اپنے ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر سبز ٹریفک لائٹ کی حفاظت میں زیبرا کراسنگ پر چلتے ہوئے بھی موت کا فرشتہ میرا گلا دبوچنے کے لیے آناً فاناً غیب سے نازل ہو سکتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد میری خود اعتمادی کسی قدر بحال ہوئی اور میں نے اپنی ٹریننگ کا باقی حصہ بھی خوش اسلوبی سے طے کر لیا۔ چند آزمائشی مشقوں میں پورا اترنے کے بعد میں نے عفت اور ثاقب کے نام ایک مختصر سا وصیت نامہ لکھ کر اس مہم کے معتمد کے حوالے کیا' اور پھر ایک روز پیرس کے اورلی ہوائی اڈے پر تل ابیب جانے کے لیے اسرائیل ہوائی کمپنی (ElAl) کے جہاز پر سوار ہو گیا۔

جہاز میں بیٹھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں واقعی سفر آخرت پر روانہ ہو رہا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میرے دل پر بزدلی' افسردگی اور مردنی کی برف جم گئی۔ خوف و ہراس نے ایک بار پھر مجھے اپنی گرفت میں دبوچ لیا۔ جب جہاز کا دروازہ بند ہوا تو میری حالت اس لاش کی طرح ہو گئی جس کے اوپر پتھر کی سلیں اور منوں مٹی ڈالنے کے بعد سب

For more books visit www.4Urdu.com

لوگ اسے اکیلا چھوڑ کر قبرستان سے واپس چلے گئے ہوں۔ زمین پر تا حد نگاہ پھیلے ہوئے مکانوں کے مکینوں پر مجھے رشک آنے لگا جو ہر خوف اور خطرے سے بے نیاز اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہنسی خوشی وقت گزار رہے تھے۔ مجھے بے اختیار اپنی بیوی' اپنا بیٹا' اپنا بھائی' اپنی بہن' اپنے سارے عزیز و اقارب اور دوست یاد آنے لگے جو ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ ایک ایک کر کے ماضی کی کسی بے تھاہ سرنگ میں غائب ہوتے جا رہے تھے۔ اگر یہ جہاز اسرائیلی ہوائی کمپنی کا نہ ہوتا تو شاید میں اپنی نشست پر کھڑا ہو کر زور زور سے چیخیں مار کر رونے لگتا۔

ہوائی جہاز تھوڑی دیر کے لیے روم کے ہوائی اڈے پر بھی اترا۔ ٹرانزٹ لاؤنج کی قد آدم کھڑکیوں سے میں نے باہر جھانکا تو دور تک ملک ملک اور کمپنیوں کے طرح طرح کے ہوائی جہاز قطار در قطار کھڑے نظر آئے۔ ان میں ایک جگہ پی آئی اے کا ڈی سی ۱۰ بھی دکھائی دیا۔ پی آئی اے کے ہوائی جہاز کی جھلک میرے اضطراب پر تسلی اور سکون کی شبنم بن کر ٹپکی۔ اس سکون بخش منظر نے میرے خوفزدہ وجود میں تحلیل نفسی کی ایسی اگربتی سلگا دی کہ معاً خجالت' ندامت' تشکر اور خود اعتمادی کے ملے جلے احساس سے میرا دل بھر آیا۔ ایک قریبی ٹائلٹ میں گھس کر میں نے اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ پہلے خوب رویا۔ جب دل کی بھڑاس اچھی طرح نکل گئی' تو میں نے اپنے پاؤں کا جوتا کھولا اور اسے ہاتھ میں لے کر سات آٹھ بار اپنے سر پر زور زور سے مارا۔ غالباً اس جھاڑ پھونک سے خوف و ہراس اور کمزوری اور بزدلی کے بھوت کا سایہ میرے سر سے اتر گیا۔

تل ابیب کے ہوائی اڈے پر کسٹم والوں سے فارغ ہو کر جب میں اپنا سامان لیے باہر نکلا' تو اسرائیل کی ٹورسٹ کارپوریشن کے ایک خوش لباس نوجوان نمائندے نے لپک کر مجھے خوش آمدید کہا۔ گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے دبی زبان سے وہ شناختی الفاظ بھی ادا کئے جن کے متعلق مجھے پیرس میں آگاہ کر دیا گیا تھا۔ جواباً میں نے بھی

For more books visit www.4Urdu.com

اپنے مقرر کردہ شناختی الفاظ دہرائے۔ اس کے بعد "مصطفیٰ" نے اگلے دس روز کے لیے میرا مکمل چارج سنبھال لیا۔

مصطفیٰ اس نوجوان کا کوڈ نام تھا۔ چھبیس ستائیس برس کا یہ پڑھا لکھا فلسطینی جوان کئی سال سے جان کی بازی لگا کر اسرائیل میں آزادی وطن کی خاطر طرح طرح کے خفیہ فرائض سر انجام دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک بجلی کی طرح کوندتی تھی اور اس کی رگ رگ میں جہاد کا جوش اور جنون سیماب کی مانند بے چینی سے گردش کر رہا تھا۔ دن رات وہ میرے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا تھا اور قدم قدم پر انتہائی شفقت اور احترام سے میری رہنمائی اور خدمت کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے اخی اور سیدی کے القاب سے پکارتا تھا۔ اسی کے زیر اہتمام میں یونیسکو کے قائم کردہ بہت سے سکولوں میں گیا اور ۱۳ شر انگیز کتابوں کے نسخے حاصل کئے جو اسرائیلوں نے یونیسکو کے نصب شدہ نصاب کی جگہ وہاں پر زبردستی رائج کر رکھے تھے۔ ان کتابوں پر میں نے ہیڈ ماسٹروں اور کئی دیگر اساتذہ کے آٹو گراف بھی لیے۔ یہ وہ یہودی ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ تھے جنہیں اسرائیلیوں نے یونیسکو کو دھوکہ دے کر مسلمان اساتذہ کی جگہ تعینات کر رکھا تھا۔ کئی جگہ میں نے ان کو بہت سی خفیہ تصویریں اتاریں۔ ایک دو سکولوں میں وہاں کے یہودی اسٹاف کے ساتھ میرا گروپ فوٹو بھی کھینچا گیا۔ ایک سکول میں ایک فلسطینی بچے کو انتہائی بے دردی کے ساتھ نہایت کڑی اور ذلت آمیز سزا مل رہی تھی۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنی کتاب کا وہ حصہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں انتہائی گستاخ الفاظ درج تھے۔ ہم نے اپنے خفیہ کیمرے کی مدد سے اس سین کی پوری فلم اتار لی جس کی لمبائی دو سو فٹ سے کچھ اوپر تھی۔

اسرائیل میں آئے ہوئے مجھے پانچواں روز تھا کہ اچانک مصطفیٰ بولا۔ "یا اخی' اب تک تو تم نیند کے بغیر ٹھیک گزارہ کر رہے تھے' لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے قدم

For more books visit www.4Urdu.com

لڑکھڑانے لگے ہیں اور تمہاری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "ابھی پانچ روز باقی ہیں۔ کام تو ختم کرنا ہے۔"

URDU4U.COM

اس وقت تو وہ مسکرا کر چپ ہو گیا' لیکن نماز عشاء کے وقت مجھے ایک ٹیکسی میں بٹھا کر مسجد اقصیٰ لے گیا۔ اس زمانے میں عشاء کے بعد اگلی اذان تک مسجد کے دروازے مقفل ہو جاتے تھے۔ الاقصا کے کلید بردار مصطفیٰ کے ہمراز تھے۔ ان کے ساتھ ساز باز کر کے نماز کے بعد اس نے مجھے اندر اکیلا چھوڑ کر باہر تالا لگوا دیا اور یہ ہدایت کر گیا کہ میں رات بھر خوب اطمینان سے اپنی نیند پوری کر لوں۔ فجر کے بعد وہ مجھے اسی جگہ آ ملے گا۔

قبلہ اول کی چار دیواری کے اندر جب میں اکیلا رہ گیا تو تاریخ اور تقدس کے ایک مہیب سناٹے نے مجھے سر سے پاؤں تک غڑاپ سے نگل لیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی پاکیزہ شیش محل میں ایک کتا غلطی سے بند ہو گیا ہے۔ لرزے کے بخار کی طرح میرے تن بدن پر کپکپی طاری ہو گئی اور دانت بے اختیار کٹ کٹ بجنے لگے۔ مرگی کے مریض کی مانند تشنج میں گرفتار ہو کر آناً فاناً لڑھکتا ہوا ایک ایسی ٹائم ٹنل میں جا گرا جہاں پر نسل انسانی کی ہزاروں سال کی خوابیدہ تاریخ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی اور کہکشاں کی طرح جگمگ کرتی ہوئی شاہراہوں پر بڑے بڑے ذیشان پیغمبروں کے قدموں کی خاک سے نور کے چشمے پھوٹنے لگے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام' حضرت داؤد علیہ السلام' حضرت سلیمان علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور پھر اللہ کے آخری نبی خاتم النبیین رحمت اللعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جنہیں اللہ کی پاک ذات شب کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی تا کہ ان کو اپنے کچھ عجائبات قدرت دکھائے۔ اسی مسجد میں فرش سے عرش تک نوری فرشتوں نے وہ راستہ منور کر دیا جس پر نبوت کا سفر اختیار کر کے حضور نے رسالت کی معراج کو پایا۔ سدرہ المنتہٰ کے پاس جس کے قریب جنت الماویٰ ہے۔ جب اس سدرہ المنتہٰ کو لپٹ رہی

For more books visit www.4Urdu.com

تھی' جو چیزیں لپٹ رہی تھیں نگاہ تو نہ ہٹی اور نہ بڑھی' انہوں نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے۔"

خبر نہیں یہ وصال کی گھڑی تھی یا فراق کا لمحہ' کہ عین اس وقت فضا میں اذان کی آواز گونجی اور بچپن میں کہیں پڑھا ہوا یہ پرانا شعر مجھے بے اختیار یاد آ گیا۔

خدا سمجھے موذن سے کہ ٹوکا عین عشرت میں
چھری مجھ پر چلا دی نعرۂ اللہ اکبر سے

خدا کا شکر ہے کہ پیرس واپس آنے کے بعد اسرائیل سے لائی ہوئی میری شہادتوں کو یونیسکو والوں نے تسلیم کر لیا۔ ڈائریکٹر جنرل نے ایسے اقدامات کئے کہ مقبوضہ عرب علاقوں میں یونیسکو کے قائم کردہ تمام سکولوں میں عربوں کا منظور شدہ درسی نصاب از سر نو رائج ہو گیا۔ اور اسرائیل کی لگائے ہوئی ۱۱۳ شر انگیز کتابیں بھی منسوخ ہو گئیں۔ اس کے علاوہ آئندہ اس صورت حال پر کڑی نظر رکھنے کے لیے قابل اطمینان بندوبست کر دیا گیا۔

میری اس حقیر سی خدمت کے اعتراف کے طور پر پیرس میں متعین تمام عرب سفیروں نے ایک مشترکہ تقریب منعقد کی۔ صدر ناصر کا ایک ذاتی نمائندہ اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے خاص طور پر قاہرہ سے آیا۔ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد میں ان دنوں بیروزگار تھا' اس لیے کئی سفیروں نے اشاروں کنایوں میں اور چند ایک نے کھلے بندوں مجھے منہ مانگے انعامات نذر کرنے کی پیشکش کی۔ ان سب کی خدمت میں میرا صرف یہ جواب تھا کہ یہ معمولی سا فرض میں نے کسی دنیاوی لالچ یا غرض و غایت سے ادا نہیں کیا' میں اسے اپنے لیے محض توشہ آخرت سمجھتا ہوں۔

اس واقعہ کے ایک برس بعد انگلستان کے گاؤں وگمور میں ایک رات میں اپنے گھر سو

For more books visit www.4Urdu.com

رہا تھا۔ آدھی رات کے قریب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب مصطفیٰ بیروت کے ایک ہسپتال سے بول رہا تھا۔ ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ اس طرح کی تھی۔

URDU4U.COM

"ہیلو مصطفیٰ تم کیسے ہو؟"

"الحمدللہ خوش و خرم ہوں۔"

"اگر خوش و خرم ہو تو ہسپتال سے کیوں بول رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بلڈ کینسر تشخیص ہوا ہے۔ علاج کروا رہا ہوں۔"

"توبہ توبہ' بلڈ کینسر کی بات تم ایسے کر رہے ہو جیسے معمولی زکام ہو۔ تم اصلی بات بتاؤ کہ تمہارا حال کیسا ہے؟"

"یا اخی' اللہ کی رضا پر راضی ہوں۔"

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اندازہ ہے کہ انشاء اللہ میں بہت جلد اپنے خالق سے جا ملوں گا۔"

"تم موت کا ذکر یوں کر رہے ہو جیسے کسی پکنک پر جا رہے ہو۔ علاج تو سنجیدگی سے کروا رہے ہو نا؟"

"الحمدللہ علاج خوب ہو رہا ہے۔ ماشاء اللہ میں راضی برضا ہوں۔ تم میرے لیے حسن خاتمہ کی دعا کرنا۔ میرے بعد اگر میرا والد تمہیں کوئی خط لکھے تو اسے جواب ضرور دینا۔"

چند ہفتے بعد مجھے اس کے والد کا خط ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ مصطفیٰ مرحوم ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی یاد میں وہ بلڈ کینسر کے نادار مریضوں کے علاج اور مدد کے لیے دس لاکھ امریکن ڈالر کا ایک فنڈ قائم کر رہا ہے۔ جس کا انتظام ایک تین رکنی مینجنگ کمیٹی کے ہاتھ میں ہو گا۔ مصطفیٰ کی وصیت تھی کہ اس کمیٹی کا ایک رکن مجھے نامزد کیا جائے۔

میں آٹھ برس تک اس فنڈ کی منتظمہ کا ممبر رہا۔ اس عرصہ میں بلڈ کینسر کے ۱۱۵۴

For more books visit www.4Urdu.com

نادار مریضوں کو قومیت اور مذہب کے امتیاز کے بغیر طبی اور دیگر مالی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ پھر مصطفیٰ کے والد گرامی کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد بیروت کے فسادات اور خانہ جنگی کے دوران مصطفیٰ کے نام پر یہ صدقہ جاریہ بھی رفتہ رفتہ بند ہو گیا۔

URDU4U.COM

صوم و صلوٰہ کے پابند جواں سال مصطفیٰ کی سیماب صفت شکل و صورت آج تک میری آنکھوں کے سامنے گھومتی پھرتی نظر آتی ہے۔ کروڑ پتی باپ کے اس اکلوتے مجاہد بیٹے نے اسرائیل میں دس روز تک لگاتار میری خدمت گھریلو ملازموں کی طرح کی۔ ہم جہاں کہیں ستانے کے لیے کچھ دیر بیٹھتے تھے' وہ فوراً اپنے بریف کیس سے ایک جھاڑن نکال کر میرے بوٹ صاف کر دیتا تھا۔ اسرائیل سے واپسی کے وقت میرے پاس آٹھ اسرائیلی پاؤنڈ بچے ہوئے تھے جو اس زمانے میں تقریباً ۱۸ روپے کے برابر تھے۔ حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر میں نے یہ ساری رقم ٹپ کے طور پر مصطفیٰ کو دے دی۔ اس نے اسے وصول کر کے آنکھوں سے لگایا اور انتہائی اظہار تشکر کے ساتھ جیب میں ڈال لیا۔ مصطفیٰ کا اصلی بھید تو مجھے معلوم نہیں' لیکن جب کبھی یہ چھوٹے چھوٹے واقعات یاد آتے ہیں تو اس کے کردار کی عظمت کی حرارت میرے وجود پر جمی ہوئی بے حسی کی برف کو کسی قدر پگھلا دیتی ہے۔ اور اس کی جدائی کا احساس ایک بار پھر میرے دل و دماغ کی ظلمت پر چند لمحوں کے لیے ایک ناقابل بیان غمگینی' رنگینی اور نور کی پھوار سی برسا جاتا ہے۔

سورج بنتا ہے تار زر سے
دنیا کے لیے ردائے نوری!
عالم ہے خموش و مست گویا
ہر شے کو نصیب ہے حضوری
دریا' کہسار' چاند' تارے
کیا جانیں فراق و ناصبوری

For more books visit www.4Urdu.com

شایاں ہے مجھے غم جدائی
یہ خاک ہے محرم جدائی

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

- عفت

۱۷ جون ۱۹۷۴ء
آج عفت مر گئی۔

میں اسے مذاقاً اپنی "بڑھیا" کہا کرتا تھا۔ لیکن جب میں کنٹربری کاؤنٹی کونسل کے دفتر میں تدفین کا اجازت نامہ حاصل کرنے گیا تو ایک فارم پر کرنا تھا۔ اس میں مرحومہ کی تاریخ پیدائش بھی درج کرنا تھی۔ جب میں نے اس کا پاسپورٹ نکال کر پڑھا' تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس کی عمر فقط ۴۱ برس تھی۔

لیکن میرے لیے وہ ہمیشہ میری "بڑھیا" کی بڑھیا ہی رہی۔ کنٹربری ہسپتال میں ہم نے اسے گرم پانی میں آب زمزم ملا کر غسل دیا۔ پھر کفنایا اور جب اسے قبلہ رو کر کے لکڑی کے بنے ہوئے ہلکے بادامی رنگ کے تابوت میں رکھا تو تنویر احمد خاں نے بے ساختہ کہا۔ "ارے' یہ تو ایسے لگتی ہے جیسے ابھی کالج کے فرسٹ ایئر میں داخلہ لینے جا رہی ہو۔"

بات بھی سچی تھی۔ جب میں اسے بیاہ کر لایا تھا' تو وہ لاہور کے فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے فائنل ایئر سے نکلی تھی۔ جب میں نے اسے دفنایا تو واقعی وہ ایسے لگ رہی تھی جیسے ابھی ابھی فرسٹ ایئر میں داخلہ لینے جا رہی ہو۔ درمیان کے اٹھارہ سال اس نے میرے ساتھ یوں گزارے جس طرح تھرڈ کلاس کے دو مسافر پلیٹ فارم پر بیٹھے ہوں۔ سامان بک ہو چکا ہو۔ ٹرین کا انتظار ہو۔ اس کی گاڑی وقت سے پہلے آ گئی۔ وہ اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ میری ٹرین لیٹ ہے۔ جب آئے گی' میں بھی اس میں سوار ہو جاؤں گا۔ لیکن سامان کا کیا ہو گا؟ جو کبھی آگے جاتا ہے اور کبھی پیچھے' اور کوئی اسے وصول کرنے کے لیے موجود نہیں ہوتا۔

لیکن ہمارے سامان میں آخر رکھا ہی کیا ہے؟ کچھ کاغذ' ڈھیر ساری کتابیں' کچھ کپڑے'

For more books visit www.4Urdu.com

بہت سے برتن اور گھریلو آرائش کی چیزیں جنہیں عفت نے بڑی محنت سے سیلز میں گھوم گھوم کر جمع کیا تھا۔ اور ایک ثاقب۔ لیکن ثاقب کا شمار نہ سامان میں آتا ہے نہ احباب میں۔ یہ بارہ سال کا بچہ میرے لیے ایک دم بوڑھا ہو گیا۔ کنٹربری کے قبرستان میں جب مٹی کے گرتے ہوئے ریلوں نے عفت کے تابوت کا آخری کونہ بھی ہماری نظر سے اوجھل کر دیا تو ہم دونوں جو بڑی بہادری سے کھڑے ہوئے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے' بیک وقت گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہمارے گھٹنے ہمارے اندر کے بوجھ سے دب کر اچانک دہرے ہو گئے۔ چند لمحوں کے لیے ثاقب نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا' اسے زور سے دبایا' پھر خاموشی سے چھوڑ دیا۔ ہم دونوں نے اب تک ایک دوسرے کے سامنے کبھی آنسو نہیں بہائے۔ نہ آئندہ ایسا کوئی ارادہ ہے۔ لیکن صد حیف! کہ اب میرے پاس وہ بچہ نہیں جسے گلے سے لگا کر میں دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ میرے پاس صرف ایک بارہ سال کا بوڑھا انسان ہے جو باپ کی طرح میری دیکھ بھال کرنے پر مامور ہو گیا ہے۔ یہ گر اس نے اپنی امی سے سیکھا ہے۔ ہماری شادی خانہ آبادی کے پانچ برس بعد جب ماں جی فوت ہو گئیں' تو عفت نے بھی یہی چالاکی برتی تھی۔ ماں جی کے مرتے ہی عفت نے فوراً ان کا کردار اپنا لیا تھا۔ عین اس طرح جیسے عفت کے مرتے ہی ثاقب میرا مائی باپ بن بیٹھا ہے۔ پتہ نہیں یہ ماں اور بیٹا کیسے لوگ ہیں۔ یہ خود تو صبر و شکر کا بادبان تان کر ہنسی خوشی زندگی اور موت کے سمندر میں کود جاتے ہیں اور مجھے بے یار و مددگار اکیلا ساحل پر چھوڑ جاتے ہیں' جیسے میں انسان نہیں پتھر کی چٹان ہوں۔ خیر' اللہ انہیں دونوں جہان میں خوش رکھے۔ میرا کیا ہے؟ میں نہ اس جہان کے قابل نہ اس جہان کے۔ کوئی تنہائی سی تنہائی ہے۔

میرا خیال ہے کہ میری اس عجیب سی تنہائی کا احساس عفت کو بھی ضرور تھا۔ بات تو اس نے کبھی نہیں کی۔ لیکن عملی طور پر اس نے اس بے نام خلا کو پر کرنے کی بے حد کوشش کی۔ یہ کوشش پورے ۱۸ سال جاری رہی۔ لیکن میرے لیے اس کا ڈرامائی کلائمکس اس کی وفات سے عین پندرہ روز پہلے وقوع پذیر ہوا۔

For more books visit www.4Urdu.com

۲ جون کی تاریخ اور اتوار کا دن تھا۔ چاروں طرف چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئے تھی۔ عفت صبح سے ثاقب کے ساتھ ایک کیاری میں دھنیا' پودینہ' ٹماٹر اور سلاد کے بیج بجوا رہی تھی۔ پھر اس نے گلاب کے چند پودوں کو اپنے ہاتھ سے پانی دیا۔ اس کے بعد ہم تینوں لان میں بیٹھ گئے۔ عفت نے بڑے وثوق سے کہا۔ "یہ کیسا سہانا سماں ہے۔ غالباً بہشت بھی کچھ ایسی ہی چیز ہو گی۔"

"پتہ نہیں۔" میں نے کہا۔

عفت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یہ اس کا آخری بھرپور قہقہہ تھا جو میں نے سنا۔ وہ بولی۔

"تم مجھے کچھ نہیں بتاتے۔ ممتاز مفتی جو کچھ لکھتے ہیں' اس سے مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ تمہیں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ آخر مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔"

میں نے کہا۔ "ممتاز مفتی کو جانتی ہو' بہت بڑا افسانہ نگار ہے۔ جو جی میں آئے لکھتا رہتا ہے۔ اس نے میرے سر پر سبز عمامہ باندھ کر اور اس پر مشک کافور کا برادہ چھڑک کر مجھے ایک عجیب و غریب پتلا سا بنا رکھا ہے۔ وہ دیدہ و دانستہ عقیدے سے بھاگتا اور عقیدت کا روگ پالتا ہے۔ اس کی کسی بات پر دھیان نہ دو۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "یہ ممتاز مفتی بھی عجیب آدمی ہیں۔ میرے ساتھ بڑی محبت کرتے ہیں۔ ثاقب کے ساتھ گھنٹوں بچوں کی طرح کھیلتے ہیں۔ لیکن وہ جب میرے پاس تمہاری باتیں کر کے جاتے ہیں تو مجھے یہ احساس ہونے لگتا ہے جیسے میں تمہاری بیوی نہیں بیوہ ہوں۔"

"یہی تو اس کی افسانہ نگاری کا کمال ہے۔" میں نے کہا۔

وہ تنک کر بولی۔ "مفتی جی کو گولی مارو۔ آؤ آج ہم دونوں عیش کریں۔ اس ملک میں ایسی اچھی دھوپ روز روز تھوڑا نکلتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھی۔ جلدی جلدی مٹر اور قیمہ پکایا۔ کچھ چاول ابالے اور سلاد کاٹا۔ ہمیں کھانا کھلا کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جامنی رنگ کی شلوار قمیض پہنی' ڈھیر سارا میک اپ کیا' اور جب خون بن ٹھن کر نکلی تو ثاقب نے بے ساختہ کہا۔ "واہ واہ

For more books visit www.4Urdu.com

امی! آج تو بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ اب تو ابو کی خیر نہیں۔"

"زیادہ بک بک نہ کیا کرو۔" اس نے ثاقب کو ڈانٹا۔ "تم اپنا سائیکل نکالو اور خالد کے گھر چلے جاؤ۔ شام کو طارق کی سالگرہ ہے۔ ہم بھی پانچ بجے تک پہنچ جائیں گے۔"

ثاقب نے گھڑی دیکھ کر شرارت سے کہا۔ "امی' ابھی تو صرف دو بجے ہیں۔ پانچ بجے تک آپ اکیلے کیا کریں گے؟"

"ہم مزے کریں گے۔" عفت نے کہا۔ "اب تم جاؤ۔"

ثاقب اپنے بائیسکل پر بیٹھ کر خالد کے ہاں چلا گیا۔ میں نے عفت سے کہا۔ "آج تو تم زبردست موڈ میں ہو۔ بولو' کیا ارادہ ہے؟"

اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کہنے لگی۔ "اب میں تمہارے کسی کام کی نہیں رہی۔ چلو پارک چلیں۔"

ہم دونوں ٹیکسی لے کر اس کے ایک مرغوب پارک میں چلے گئے' چاروں طرف جوان بوڑھے جوڑے ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے ہوئے سبز گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ بہت سے فوارے چل رہے تھے۔ گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ چیری کے درخت گلابی اور سرخ پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ آس پاس ٹھنڈے دودھ اور رنگا رنگ مشروبات کی بوتلیں بک رہی تھیں۔ ہم دونوں لکڑی کے اس بنچ پر ایک دوسرے سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئے۔

اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور بولی۔ "بہشت کا نظارہ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہو گا!"

"پتہ نہیں۔" میں نے کہا۔

"تم مجھے کچھ نہیں بتاتے۔" اس نے شکایت کی۔ "ممتاز مفتی تمہیں مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔"

"مفتی جی افسانہ نگار ہیں۔" میں نے کہا۔ "ان کو گولی مارو' اپنی بات کرو۔"

"میری بات صرف اتنی ہے کہ میں تیرے کسی کام نہ آ سکی۔" وہ بولی۔

For more books visit www.4Urdu.com

"یہ فضول بکواس چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "کوئی کام کی بات کرو۔"

"واقعی کروں؟" اس نے ایسے انداز سے کہا جیسے کوئی بچہ ٹافی خریدنے کے لیے خوشامد کر کے پیسے مانگنے والا ہو۔ "برا تو نہیں مناؤ گے؟ بات کاٹو گے تو نہیں؟ ٹالو گے تو نہیں؟"

URDU4U.COM

"بالکل نہیں۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

وہ لکڑی کے بنچ پر مجھے تکیہ بنا کر لیٹ گئی۔ اور بولی۔ "سنو' جب میں مر جاؤں تو مجھے کنٹربری کے قبرستان میں دفنا دینا۔"

اس کے منہ سے موت کا یہ پیغام سن کر مجھے بڑا شدید دھچکا لگا۔ لیکن میں نے اس کی بات نہ کاٹنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اس لیے بالکل خاموش رہا۔

وہ بولتی گئی۔ "یہ شہر مجھے پسند ہے۔ یہاں کے ہسپتال نے مجھے بڑا آرام دیا ہے۔ یوں بھی اس شہر پر مجھے حضرت مریم کا سایہ محسوس ہوتا ہے۔ یہاں پر تمہیں بھی کچھ محسوس ہوتا ہے یا نہیں؟"

اس نے منہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ اس نے اپنے جامنی رنگ کے دوپٹے کے پلو سے میرے آنسو پونچھے اور بے حد غیر جذباتی انداز میں اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔" اس ملک میں ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ اس لیے میرے جنازے پر کسی کو نہ بلانا۔ یہاں پر تم ہو' ثاقب ہے' خالد ہے' زہرہ ہے' آپا عابدہ ہے۔ خالد کے چند مسلمان ڈاکٹر دوست ہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔"

اب میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "بزنس آخر بزنس ہے۔" میں نے کہا۔ "جرمنی سے تنویر احمد خاں اور پیرس سے نسیم انور بیگ شاید آ جائیں۔ ان کے متعلق کیا حکم ہے؟"

"وہ آ جائیں تو ضرور آئیں۔" اس نے اجازت دے دی۔ "وہ بھی تو اپنے ہی لوگ ہیں۔ لیکن پاکستان سے ہرگز کوئی نہ آئے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ "ایک دو عزیز جو استطاعت رکھتے ہیں ضرور آ جائیں گے۔ لیکن دوسرے بہت

For more books visit www.4Urdu.com

سے عزیز جن میں آنے کی تڑپ تو ہے' لیکن آ نہیں سکتے خواہ مخواہ ندامت سی محسوس کریں گے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"میڈم' آپ کا اشارہ سر آنکھوں پر۔" میں نے جھوٹی سی ہنسی ہنس کر کہا۔

URDU4U.COM

"اور کوئی ہدایت؟"

"میری قبر کے کتبے پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ضرور لکھوانا۔"

"ضرور" میں نے کہا۔ "اور کوئی حکم؟"

"ہاں' ایک عرض اور ہے۔" اس نے کہا۔ "اپنے ہاتھوں کے ناخن بھی خود کاٹنا سیکھ لو۔ دیکھو اس چھوٹی سی عمر میں بھی ثاقب کیسی خوبی سے اپنے ناخن کاٹ لیتا ہے۔ تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھی' اپنا پرس کھولا۔ ایک چھوٹی سی قینچی نکالی اور بولی۔ "لاؤ' آج میں پھر تمہارے ناخن تراش دوں۔"

اس نے میرے ناخن کاٹے۔ اس آخری خدمت گزاری کے بعد وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر بیٹھ گئی۔ اور اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔

مجھے اچھا تو بڑا لگا کیونکہ اس سے پہلے ہم بر سر عام اس طرح کبھی نہ بیٹھے تھے۔ لیکن اس کی باتوں میں الوداعیت کا جو پیغام جھلک رہا تھا' اس نے مجھے بے تاب کر دیا۔ میں نے کہا۔ "میڈم' اٹھو۔ ہمارے ارد گرد جو بے شمار بچے کھیل کود رہے ہیں' وہ کیا سمجھیں گے کہ یہ بڈھا بڈھی کس طرح کی عاشقی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔"

وہ چمک کر اٹھ بیٹھی اور حسب دستور مسکرا کر بولی۔ "یہ لوگ یہ سمجھیں گے نا کہ کوئی بوالہوس بوڑھا کسی چھوکری کو پھانس لایا ہے۔ کبھی تم نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے۔"

"ہاں' روز ہی دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اس نے میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے آخری بار کنگھی کی' اور بولی۔ "تمہارے بال

For more books visit www.4Urdu.com

کتنے سفید ہو رہے ہیں۔ میں نے اتنی بار کہا ہے کہ مہینے میں کم از کم ایک بار کلر گلو کا شیمپو کر لیا کرو۔ لیکن تم میری کوئی بات نہیں مانتے۔"

URDU4U.COM

میں خاموش رہا۔

اس نے مجھے گدگدا کر ہنسایا اور کہنے لگی۔ "تمہیں ایک مزے کی بات سناؤں۔"

"ضرور سناؤ۔" میں نے کہا۔

وہ بڑے فخریہ انداز میں کہنے لگی۔ "کوئی دو برس پہلے میں نسیم انور بیگ کی بیگم اختر کے ساتھ آکسفورڈ اسٹریٹ میں شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ وہاں اس کی ایک سہیلی مل گئی۔ اس نے میرا تعارف یوں کرایا کہ یہ عفت شہاب ہے۔ یہ سن کر اختر کی سہیلی نے بے ساختہ کہا' ارے ہم نے تو سنا تھا کہ شہاب صاحب کا صرف ایک بیٹا ہے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ان کی اتنی بڑی بیٹی بھی ہے۔ دیکھا پھر.....؟"

"ہاں ہاں بیگم صاحبہ' دیکھ لیا۔" میں نے جھینپ کر کہا۔ "پانچ بجنے کو ہیں۔ چلو' طارق کی سالگرہ پر بھی تو جانا ہے۔"

یہ ہمارا آخری انٹرویو تھا۔ اٹھارہ سال کی ازدواجی زندگی میں ہم نے کبھی ایک دوسرے کے ساتھ بیک وقت اتنی ڈھیر ساری باتیں نہ کی تھیں۔ دوستوں' یاروں اور عزیزوں کے ساتھ بیٹھ کر ہم کئی کئی گھنٹے ہی ہی' ہا ہا کر لیتے تھے۔ لیکن اکیلے میں ہم نے اتنی دل جمعی کے ساتھ اتنے موضوعات پر کبھی اتنی طویل گفتگو نہ کی تھی۔ یہاں تک کہ جب میں نے سی ایس پی سے استعفیٰ دیا تو یوں ہی ایک فرض کے طور پر مناسب سمجھا کہ اپنی بیوی سے بھی مشورہ کر لوں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں ملازمت سے مستعفی ہونا چاہتا ہوں تو وہ ثاقب کے سکول جانے سے پہلے اس کے لیے آملیٹ بنا رہی تھی' آملیٹ بنانے کا چمچہ ہاتھ سے چھوڑے بغیر اور میری طرف آنکھ اٹھائے بغیر وہ بولی۔

"اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو بسم اللہ۔ ضرور استعفیٰ دے دو۔"

اس کی اس شان استغنا سے جل کر میں نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "بیگم صاحبہ'

For more books visit www.4Urdu.com

آپ کی رضامندی کے بغیر میں ایسا قدم کیسے اٹھا سکتا ہوں؟ اور ایک آپ ہیں کہ کوئی توجہ ہی نہیں دیتیں۔"

اس نے چمچہ ہاتھ سے رکھ دیا اور میری طرف یوں پیار سے دیکھا جیسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ پھر بولی۔ "ارے یار' تجھے کیسے سمجھاؤں کہ جو تیری مرضی وہ میری مرضی۔"

مجھے یہ زعم تھا کہ میں خود فنا کی تلاش میں ہوں۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ عفت پہلے ہی اس مقام سے گزر چکی ہے۔ جب وہ تابوت میں لیٹی پڑی تھی تو میں نے چپکے سے اس کے سر پر آخری بار ہاتھ پھیر کر پیار کیا۔ میرے اندر کے توہمات نے میرے سینے میں عجیب و غریب امیدوں کی موم بتیاں سجا رکھی تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی معجزے کی ایک بھی موم بتی روشن نہ ہوئی۔ وہ مر گئی تھی۔ ہم نے اسے قبرستان میں لے جا کر دفنا دیا۔ باقی اللہ اللہ خیر سلا۔

یوں تو آپس کی روٹھ راٹھ' چھوٹی موٹی ناراضگیاں اور باہمی شکر رنجیاں ہمارے درمیان درجنوں بار ویسے ہی ہوئیں جیسے ہر میاں بیوی کے درمیان ہونا چاہئیں۔ لیکن ہماری اصلی بڑی لڑائی صرف ایک بار ہوئی۔ اسلام آباد میں میں نے اپنے ڈرائنگ روم کے لیے قالین خریدنا تھا۔ میں نے بڑے شوق سے ایک قالین پسند کیا۔ جس کی زمین سفید اور درمیان میں رنگین پھول تھے۔ عفت نے اسے فوراً یہاں مسترد کر دیا جس طرح وہ چالاک سبزی فروش کو الٹے ہاتھوں باسی پالک' مولی' گاجر اور گوبھی کے پھول لوٹا رہی ہو۔ مجھے بڑا رنج ہوا۔ گھر آ کر میں نے سارا دن اس سے کوئی بات نہ کی۔ رات کو وہ میرے پہلو میں آ کر لیٹ گئی اور اپنے دونوں ہاتھ میرے گالوں پر رکھ کر کہنے لگی۔ "دیکھ تیرا منہ پہلے ہی بڑا گول ہے۔ جب تو ناراض ہوتا ہے تو یہ اور بھی گول مٹول ہو جاتا ہے۔ آج بھلا تو اتنا ناراض کیوں ہے؟"

میں نے قالین کی بات اٹھائی۔

"قالین تو نہایت عمدہ ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن ہمارے کام کا نہیں۔"

For more books visit www.4Urdu.com

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"دراصل بات یہ ہے۔" وہ بولی۔ "جن لوگوں کے لیے یہ قالین بنا ہے ان میں سے کوئی بھی ہمارے ہاں نہیں آتا۔"

URDU4U.COM

"کیا مطلب؟" میں نے تلخی سے دریافت کیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور سکول کی استانی کی طرح بڑی وضاحت سے گن گن کر سمجھانے لگی کہ ہمارے ہاں ابن انشاء آتا ہے' وہ پھسکڑا مار کر فرش پر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک طرف مالٹے' دوسری طرف مونگ پھلی' سامنے گنڈیوں کا ڈھیر۔ جمیل الدین عالی آتا ہے' آتے ہی فرش پر لیٹ جاتا ہے اور سگریٹ پر سگریٹ پی کر ان کی راکھ ایش رے میں نہیں بلکہ اپنے ارد گرد قالین پر بکھیرتا ہے۔ ممتاز مفتی ایک ہاتھ میں کھلے پان اور دوسرے ہاتھ میں زردے کی پڑیا لیے آتا ہے۔ اشفاق احمد قالین پر اخبار بچا کر اس پر تربوز چیرنا پھاڑنا شروع کر دیتا ہے۔ ملتان سے ایثار راعی آم اور خربوزے لے کر آئے گا۔ ڈھاکہ سے جسیم الدین کیلے اور رس گلوں کی ٹپکتی ہوئی ٹوکری لائے گا۔ وہ یہ سب تحفے لا کر بڑے تپاک سے قالین پر سجا دیتے ہیں۔ سال میں کئی بار سید ممتاز حسین شاہ بی اے ساٹھ سال کی عمر میں ایم اے انگلش کی تیاری کرنے آتا ہے اور قالین پر فاؤنٹین پن چھڑک چھڑک کر اپنی پڑھائی کرتا ہے۔ صرف ایک راجہ شفیع ہے' جب کبھی وہ مکئی کی روٹی' سرسوں کا ساگ اور تازہ مکھن اپنے گاؤں سے لے کر آتا ہے تو آتے ہی انہیں قالین پر نہیں انڈیلتا بلکہ بڑے قرینے سے باورچی خانے میں جا کر رکھ دیتا ہے کیونکہ وہ نہ شاعر ہے نہ ادیب۔ فقط ہمارے دوستوں کا دوست ہے۔

بات بالکل سچ تھی۔ چنانچہ ہم نے ایک نہایت میل خوردہ قالین خرید کر آپس میں صلح کر لی۔

عفت کو میرے دوستوں کے ساتھ بڑا انس تھا۔ وہ ادیب پرست بھی تھی اور ادب شناس بھی۔ "شاہنامہ اسلام" کے سینکڑوں اشعار اسے زبانی یاد تھے۔ حفیظ جالندھری کا وہ اپنے

For more books visit www.4Urdu.com

باپ کی طرح ادب کرتی تھی۔ جوش صاحب کی "یادوں کی بارات" کی بھی مداح تھی۔

ایک روز میں نے کہا۔ "میں جوش صاحب کی طرف جا رہا تھا۔ آؤ تم بھی ان سے مل لو۔"

URDU4U.COM

"تم جاؤ۔" اس نے کہا۔ "میرے لیے جوش صاحب کے دور کے ڈھول ہی سہانے ہیں۔"

یحییٰ خاں کے زمانے میں جب ہم انگلستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں خاموشی سے اپنے دن گزار رہے تھے تو فیض احمد فیض لندن آئے۔ وہاں سے انہوں نے مجھے ٹیلیفون کیا کہ میں کل تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ دوپہر کا کھانا تمہارے ہاں کھاؤں گا۔

عفت نے بڑا اچھا کھانا کھایا۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ شدید برف باری ہو رہی تھی۔ لندن سے ہمارے ہاں آنے کے لیے ایک گھنٹہ ریل کا سفر کا تھا۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ بس کا سفر' اور پھر کوئی پندرہ منٹ پیدل۔ ڈھائی' تین بجے جب فیض صاحب گھٹنے گھٹنے برف میں دھنستے دھنساتے افتاں و خیزاں ہمارے ہاں پہنچے تو عفت کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ کھانا گرم کرتے ہوئے اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور بڑی عقیدت سے کہنے لگی۔

"ہم کتنے خوش نصیب ہیں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے دور کا اتنا بڑا شاعر ایسے خراب موسم میں اتنی دور تم سے ملنے آیا ہے۔"

"یہ فیض صاحب کی مروت ہے۔" میں نے کہا۔

"مروت نہیں۔" اس نے مجھے ٹوکا۔ "یہ ان کی عظمت اور سخاوت ہے۔"

ہمارے اچھے سے اچھے دنوں میں اس کا ایک مرغوب مصرع یہ تھا۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

اس پر اس نے غالباً اپنی طرف سے دوسرا مصرع یہ گانٹھ رکھا تھا۔

نہ زمیں ہو نہ زماں ہو آسماں کوئی نہ ہو

For more books visit www.4Urdu.com

بیماری کے دنوں میں وہ بار بار پڑھا کرتی۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

URDU4U.COM

اپنی تین سال کی بے وطنی کے زمانے میں ہمیں اکثر اوقات مالی تنگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دفعہ جب ہم تیسری چوتھی بار نقل مکانی پر مجبور ہو گے تو اس نے بڑی محنت سے ہمارا سامان باندھا۔ اس کی تھکن اس کے بند بند سے یوں ٹپک رہی تھی جیسے شدید بارش کے بعد ٹوٹی ہوئی چھت ٹپکنے لگتی ہے۔

میں نے اس کے پاؤں دبا کر کہا۔ "عفت میری وجہ سے تمہیں کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔"

ماں جی کی طرح وہ کبھی کبھی بہت لاڈ میں آ کر مجھے "کوکا" کہا کرتی تھی۔ بولی "ارے کوکے میں تو تیرے ساتھ بہت خوش ہوں لیکن بے چارے ثاقب پر ترس آتا ہے اس ننھی سے عمر میں یہ اس کا آٹھواں سکول ہے۔"

"ثاقب کی بات چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "آخر ہمارا بیٹا ہے۔ ہر نئے سکول میں جا کر آسانی سے فٹ ہو جاتا ہے۔ لیکن تجھے اتنا تھکا ماندہ دیکھ کر مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"ہاں' ٹھیک ہی ہوں۔" اس نے اپنا سر میرے شانوں پر ٹیک کر کہا۔ مجھے اس کے بند بند سے غالب کا یہ شعر آہ و زاری کرتا ہوا سنائی دے رہا تھا۔

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

میرا خیال ہے کہ اسی زمانے میں در بدری کی محنت و مشقت نے اسے وہ روگ لگا دیا

For more books visit www.4Urdu.com

جس نے انجام کار اسے کنٹربری کے گورستان میں جا بسایا۔ یہ خیال اب ہر وقت احساس جرم کا تازیانہ بن کر میرے ضمیر پر بڑے بے رحم کوڑے مارتا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ ایک فقیر حقیر' بندۂ پر تقصیر' اسیر نفس شریر کر بھی کیا سکتا ہے۔

جی چاہتا ہے خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے؟

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• نیا گھر

ایک نیا گھر بسا لیا تو نے
URDU4U.COM
ہم سے دامن چھڑا لیا تو نے

دل کی دنیا میں حور ہے نہ قصور
دعویٰ بے رنگ، دار بے منصور
خالی خالی سی رات کی بانہیں
شیشہ بے آب، چاندنی بے نور

جانے کیا کیا چرا لیا تو نے
ایک نیا گھر بسا لیا تو نے

چھا گئے ظلمتوں کے لات و منات
کیا ہوئی کائنات ذات و صفات
بے عصا طور پہ کھڑا ہے کلیم
نہ جستجو نہ تجلی نہ آرزو نہ بات

کچھ تو ہے جو اڑا لیا تو نے
ایک نیا گھر بسا لیا تو نے

For more books visit www.4Urdu.com

تانہ تانہ سی تیرگی کا سماں
URDU4U.COM
میٹھی میٹھی سی آگ ہلکا دھواں
موتیوں کی لڑی میں تنہائی
سنگریزوں میں گمشدہ سا نشاں

ڈھونڈھا میں نے تھا پا لیا تو نے
ایک نیا گھر بسا لیا تو نے

موج در موج خاک کا انبار
مور و ملخ و ملائکہ کی قطار
ایک تابوت نقد جاں کے عوض
ڈولی دلہن کے ساتھ چار کہار

راز جینے کا پا لیا تو نے
ایک نیا گھر بسا لیا تو نے

کیا وہاں بھی فساد اٹھتے ہیں
آگ لگتی ہے سانس گھٹتے ہیں
کیا وہاں بھی برات آئی تھی
کیا وہاں بھی سہاگ لٹتے ہیں

For more books visit www.4Urdu.com

جانے کیا کیا پتہ لیا تو نے
ایک نیا گھر بسا لیا تو نے

URDU4U.COM

خیر تیری، ترے مکاں کی خیر
تہمت آرزوئے جاں کی خیر
ہم تو پھر بھی زباں رکھتے ہیں
یا خدا میرے بے زباں کی خیر

اک نیا گھر بسا لیا تو نے
ایک نیا گھر بسا لیا تو نے

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• موسم موسم کا راگ

جاڑا آیا جاڑا آیا مونگ پھلی چلغوزے لایا
ہم تم مل بیٹھیں تو گویا کشمش اور بادام
گرمی کا موسم جو آیا باہر محنت اور پسینہ
اندر سردے گرمے لیچی ٹھنڈی میٹھے آم

برکھا رت کی بات نہ کرنا برکھا رت تو بیت گئی
تیری آنکھیں سوکھے ساگر میری آنکھوں میں طوفان
موسم گل کی رعنائیوں کو ڈھل جانے کا خوف
پت جھڑ کی سوکھی شاخوں میں جینے کے ارمان

دنیا ایک تماشا لوگو تمبولے کا کھیل
نہ تو ہارے نہ تو جیتے نہ تو پاس نہ فیل
آنے والے ایسے آئیں جیسے جھوٹے خواب
جانے والے ایسے جائیں جیسے خیبر میل

دنیا بھر کی نیرنگی دیکھی جس کا عرض نہ طول
پھولوں کی پھلواری جس میں کانٹے اور ببول
شیروں جیسے غازی جن کے بازو بے شمشیر

For more books visit www.4Urdu.com

کندن جیسی ناریں جن پر کیچڑ کنکر دھول
URDU4U .COM

پھر بھی بار بار وہ پوچھے کیا نعمت جھٹلائے؟
میں بولوں کافر کہلاؤں' کون کسے سمجھائے؟

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• ایک دن

ایک دن میں نے سوچا چلو جی تو لیں میں نے
جی بھر کے اذن طرب دے دیا
جام و مینا لیے ساقیوں کے پرے رقص
و نغمے کا جادو جگانے لگے
ایک دن کعبہ و سومنات و کلیسا و آتش
کدے جوں کے توں رہ گئے
صبر و ایماں کے فانوس گل ہو گئے'
آگہی کے قدم ڈگمگانے لگے
ایک دن ڈھل گیا' شام ڈسنے لگی' رات کا
ناگ پہرے پہ پھر آ گیا
چاند کی جھیل میں یاد کے پاسباں چشم گریاں
کے موتی چرانے لگے
ایک دن ایسا ایا جو آتا رہے گا' تیری عادتوں
سے سوا بھی نہیں
مری بندگی کا تقاضا یہی ہے میں کس منہ سے
کہہ دوں خدا بھی نہیں

URDU4U.COM

○ ڈاکٹر عفت شہاب

کرنل اطہر

○ ڈاکٹر عفت شہاب

کرنل اطہر

میں عفت سے کبھی نہیں ملا۔

For more books visit www.4Urdu.com

حالانکہ ان کے دو سگے بھائیوں حامد اور محمود سے میری بیس سال کی یاد اللہ ہے۔ میں قدرت اللہ شہاب سے بھی کبھی نہیں ملا' صرف دور سے ہسپتال کے کمرے میں دیکھا تھا۔ جب عفت بیمار تھیں اور ان سے کسی کو ملنے جلنے کی اجازت نہیں تھی۔ حامد کی بیوی بھابی سعیدہ نے فون کیا تھا اور میں اور نفیسہ صرف رسم پوری کرنے کو گئے تھے۔ کیونکہ مزاج پرسی تو صرف دیکھنے کے بعد ہی ہو سکتی تھی۔ کچھ روز پہلے میں لاہور گیا تھا۔ سعیدہ بھابی سیالکوٹ سے آئی تھیں۔ کہنے لگیں۔ "سیارہ ڈائجسٹ" میں شہاب نامہ میں عفت کی موت کا ذکر ہے۔ میں پڑھتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔"

میں اس روز سرگودھا دورے پر جا رہا تھا۔ راستہ بھر اس کا خیال رہا کہ قدرت اللہ شہاب نے ایسی کیا چیز لکھی ہے کہ انسان روتا رہا۔ سرگودھا کے ایئر فورس میس میں جا کر ٹھہرا اور یہ بھی عجیب بات ہے' قدرت اللہ شہاب کا "ماں جی" جب پڑھا تھا تو فوراً وضو کر کے ماں جی کی روح کو ایصال ثواب پہنچایا تھا اور "شہاب نامہ" پڑھ کر بھی میں نے یہی کہا۔ عفت کی روح کو ایصال ثواب پہنچایا۔ شہاب کی تحریریں اور میرے اس جذبہ میں کیا تعلق ہے' میں نہیں جانتا نہ بیان کر سکتا ہوں' میں رو نہیں سکتا' کیونکہ دو جنگوں میں میں نے موت بڑے قریب اور بڑے عزیزوں کی دیکھی ہیں۔ باقی اندر سے دل کی وہ کیفیت تھی جب انسان اپنے آپ کو موت کے قریب پاتا ہے۔ شاید یہی جذبہ ہر انسان کو اپنے معبود کی طرف کھینچتا ہے۔

کنٹربری میں نے آج سے ۲۲ سال پہلے دیکھا تھا' بہت خوبصورت جگہ تھی۔ میں خیالوں ہی میں اس قبرستان کا چکر لگانے لگا جہاں عفت دفن ہیں۔ یہ قبرستان بہت دلفریب اور پر سکون جگہ پر ہے۔

عفت نے کیا خوب اپنے لیے مستقل مقام چنا۔ یہ وہ قبرستان ہے جہاں آج سے ۲۲ سال پہلے میں نے اپنے ایک انگریز دوست کو دفن کیا تھا۔ جب میں انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا' لیکن انگلستان کی شہرہ آفاق دھند چھائی تھی'

For more books visit www.4Urdu.com

جب ہم لوگ اس نوجوان کے جنازے کو لے کر کنٹربری کے اس قبرستان میں پہنچے تھے۔ جوانی میں اپنے دوستوں کی موت کا غم ویسے ہی بڑا گہرا اور اثر پذیر ہوتا ہے۔ اپنے دوست کے تابوت کو قبر کی گہرائیوں میں جاتے دیکھ کر میں نے اپنی روح کی گہرائیوں سے اس کے لیے دعائے مغفرت کی تھی اور اس کیفیت سے میں ہفتوں نڈھال رہا تھا۔

URDU4U.COM

عفت کی موت نے بھی مجھ پر وہی اثر کیا۔ میں نے روح کی گہرائیوں سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ تصور میں میں نے عفت کے جنازے میں شرکت کی۔ ان کے تابوت کو قبر میں جاتے ہوئے دیکھا۔ قدرت اللہ شہاب کے دھندلائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ اس بچے کا تصور کیا جو بن ماں کے ہو گیا۔ اور پھر خیالات بھٹکتے ہوئے نہ جانے عفت کی والدہ تک جا پہنچے' جنہوں نے اپنے بڑے بیٹے کی اچانک موت کا غم دیکھا تھا جو فوج کا کرنل تھا اور ایک صبح ہنستے ہوئے دفتر گیا اور پھر زندہ واپس نہ آیا اور اب بیٹی کا غم دیکھنے کے لیے زندہ رہیں۔ یہ گھرانہ اتنا خدا ترس' اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننے والا اور ایسی روزمرہ کی زندگی گزارنے والا ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور عفت کی والدہ اس گھرانے کی وہ نیک بخت بی بی ہیں جنہوں نے جوان بیٹے کی موت پر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا' اور مرضی مولا کہہ کر چپ ہو رہیں۔

حامد میرا دوست' عفت کا بھائی سیالکوٹ کے ہر فلاحی ادارے کا سرگرم رکن ہے۔ اس نے اپنی ذاتی کوششوں سے ایک ایسی سوسائٹی علامہ اقبال کے نام سے قائم کی ہے' جس کے ذریعے سینکڑوں مستحق طلباء کو وظیفہ ملتا ہے اور اس سوسائٹی کے کئی وظیفہ پانے والے طالب علم ماشاء اللہ اب ڈاکٹر اور انجینئر ہیں۔

یہ میرے ذاتی مشاہدہ کی بات ہے کہ حامد نے اپنے ہر اس دوست سے جو ذرا سا بھی خوشحال ہے اس سوسائٹی کے ممبر ہونے کی درخواست کی ہے اور خدا کی قسم وہ اس کام کو اس محنت اور لگن سے کرتا ہے کہ بعض اوقات میں اپنی کم مائیگی پر آنسو بہائے

For more books visit www.4Urdu.com

بغیر نہیں رہ سکتا۔ سچ ہے دنیا ایسے ہی لوگوں کے دم سے قائم ہے۔

سعیدہ بھابی نے نہ جانے کتنی یتیم اور بے سہارا لڑکیوں کی شادیاں کرائی ہیں اور کتنے اجڑے گھرانوں کو بسوایا ہے اور یہ کام یہ دونوں میاں بیوی اس خاموشی سے کرتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ حامد' رشید اور سعیدہ بھابی پچھلے ۲۷ سال سے سیالکوٹ میں مقیم ہیں اور وہاں کا بچہ بچہ ان کو عزت و احترام سے دیکھتا ہے۔ ان کی خاموش روی کو دیکھتے ہوئے میں مزید اس میں کچھ اضافہ نہ کروں گا۔ قدرت اللہ شہاب کو ایک انسان اور ایک دوست کی حیثیت سے جاننے کی حسرت ہی رہی لیکن اگر ممتاز مفتی سچے ہیں تو شہاب اپنے اندر ایک درویش صفت انسان کو چھپائے ہوئے ہیں جو خدا کے بہت قریب ہیں۔

خدا کے اتنے اچھے بندوں سے تعلق خاطر رکھتے ہوئے بھی عفت اتنی جلدی کیوں مر گئیں؟

میرے مولیٰ! کیا تو صرف اپنے نیک بندوں ہی کا احتساب کرتا ہے یا یہی تیری مشیت ہے!

(بہ شکریہ "سیارہ ڈائجسٹ" فروری ۱۹۷۵ء)

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

• پاکستان کا مستقبل

وطن عزیز میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو پاکستان کے مستقبل کے بارے میں وقتہ فوقتہ شکوک و شبہات میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں بہت کم عوام اور بہت زیادہ خواص کی تعداد ہوتی ہے۔ خواص میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کی ایک جیب میں پاکستانی پاسپورٹ اور دوسری جیب میں امریکن گرین کارڈ یا دیگر ممالک کے اقامت نامے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ ان کے مال و متاع کا بیشتر حصہ بھی بیرونی بینکوں کی تجوریاں گرماتا ہے اور پاکستان میں وہ صرف ایسے کرنٹ اکاؤنٹ کھولنے پر قناعت کرتے ہیں جن پر زکوٰہ کٹنے کا خطرہ لاحق نہ ہو۔ اس کے علاوہ انکم ٹیکس' ویلتھ ٹیکس اور زکوٰہ سے بچ بچ کر اور غالباً منشیات کے کاروبار سے ہاتھ رنگ کر بھی کالے دھن کے انبار ایسی مہارت سے جمع کرتے ہیں کہ انجام کار حکومت ہی ان کے سامنے گھٹنے ٹیک کر دھوبی گھاٹ کھول دیتی ہے جہاں پر سرکاری افسر عجیب و غریب قوانین کا صابن مل مل کر کالی پونجی کو سفید کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ دیانت اور امانت کے ساتھ ساتھ ایک بھونڈا مذاق ہے۔

بہت سے لوگوں کے نزدیک پاکستان کی سلامتی اور استحکام کا راز فقط اس بات میں مضمر ہے کہ حالات کے اتار چڑھاؤ میں ان کے ذاتی اور سراسر انفرادی مفاد کا پیمانہ کس شرح سے گھٹتا یا بڑھتا ہے۔ ایسے لوگ قابل رحم ہیں۔ وہ بنیادی طور پر نہ تو وطن دشمن ہوتے ہیں اور نہ ہی ان پر غداری کا الزام لگانا چاہیے۔ مریضانہ ذہنیت کے یہ لوگ حرص و ہوس کی آگ میں سلگ سلگ کر اندر ہی اندر بزدلی کی راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ حوادث دنیا کا ہلکا سا جھونکا اس راکھ کو اڑا کر تتر بتر کر دیتا ہے۔ ان کا اپنا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ ان کا اصلی وطن محض ان کا اپنا نفس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو سر زمین بھی ان کی خود غرضی' خود پسندی' خود فروشی اور منافقت کو راس آئے وہ وہیں کے

For more books visit www.4Urdu.com

ہو رہتے ہیں۔ پاکستان میں اس طرح کے افراد کا ایک طبقہ موجود تو ضرور ہے لیکن خوش قسمتی سے ان کی تعداد محدود ہے۔

URDU4U.COM

اس کے برعکس پاکستانیوں کا سواد اعظم حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی حب الوطنی پر بار بار انتہائی کڑی آزمائش کے دور آتے رہے ہیں لیکن اب تک ان کے پائے ثبات میں کسی نمایاں لغزش کے آثار نمودار نہیں ہوئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے۔ البتہ ہمیں یہ ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیے کہ بار بار کفران نعمت کا مرتکب ہونے سے اللہ کے عذاب کی گرفت بھی بڑی شدید ہوتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ قوم کی قوت برداشت کا ضرورت سے زیادہ امتحان لیا جا چکا ہے۔ اب اس کے پیمانہ صبر کو لبریز ہونے سے بچانا ہم سب کا اجتماعی اور انفرادی فرض ہے۔

ایک مختصر سا وقفہ چھوڑ کر اکتوبر ۱۹۵۸ء سے لے کر بڑے طویل عرصہ تک ہماری فوجی اور سول دونوں طرح کی حکومتیں مارشل لاء کی چھتری تلے برضا و رغبت ہنسی خوشی حکمرانی کرتی رہی ہیں۔ اس عمل سے ہماری مسلح افواج پر کیا اچھے یا برے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ان کا تجزیہ کرنا فوجی ماہرین کا کام ہے۔

البتہ یہاں پر ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ ۱۹۶۹ء میں جب میں یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا ممبر تھا تو ایک صاحب سے میرے نہایت اچھے مراسم ہو گئے' جو مشرقی یورپ کے باشندے تھے۔ اور ان کا ملک اپنی مرضی کے خلاف روس کے حلقہ اقتدار میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے وطن میں بعض کلیدی اسامیوں پر رہ چکے تھے اور روس کی پالیسیوں اور حکمت عملی سے بڑی حد تک واقف اور نالاں تھے۔

ایک روز باتوں باتوں میں انہوں نے کہا۔ "اگرچہ روس اور امریکہ ایک دوسرے کے حریف ہیں لیکن بعض امور میں اپنے اپنے مفاد کی خاطر دونوں کی پالیسیاں اور منصوبے ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت اختیار کر لیتے ہیں۔"

"مثلاً؟" میں نے پوچھا۔

For more books visit www.4Urdu.com

"مثلاً پاکستان" وہ بولے۔

میری درخواست پر انہوں نے یہ وضاحت کی۔ "یہ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ پاکستان کی مسلح افواج کا شمار دنیا بھر کی اعلیٰ افواج میں ہوتا ہے۔ یہ حقیقت نہ روس کو پسند ہے اور نہ امریکہ کو۔ روس کی نظر افغانستان کے علاوہ بحیرۂ عرب کی جانب بھی ہے۔ اس کے علاوہ روس کو بھارت کی خوشنودی حاصل رکھنا بھی مرغوب خاطر ہے۔ ان تینوں مقاصد کے راستے جو چیز حائل ہے۔ وہ پاکستان کی فوج ہے۔ امریکہ کا مقصد مختلف ہے۔ امریکہ کی اصلی اور بنیادی وفاداری اسرائیل کے ساتھ ہے۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ اگر کسی وقت اسلامی سطح پر جہاد کا فتویٰ جاری ہو گیا تو پاکستان ہی وہ ملک ہے جہاں کی مسلح افواج اور نہتی آبادی کسی مزید حکم کا انتظار کئے بغیر جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر ایک دم بسوئے اسرائیل اٹھ کھڑی ہو گی۔ عالم اسلام میں اپنی تمام کامیاب ریشہ دوانیوں کے باوجود امریکہ یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ اس کے علاوہ روس کی مانند امریکہ بھی بھارت کی خیر سگالی اور خوشنودی حاصل کرنے اور بڑھانے کا آرزو مند ہے۔ پاکستان کی مسلح افواج روس' امریکہ اور بھارت کی آنکھ میں برابر کھٹکتی ہیں۔ اس لیے تمہاری فوج کو نکما اور کمزور کرنا تینوں کا مشترکہ نصب العین ہے۔

"لیکن وہ اس مشترکہ نصب العین کو پورا کیسے کر سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہنس کر بولے۔ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ہر کوئی اپنا اپنا طریق کار وضع کرنے میں آزاد ہے۔ بدی اور شر کو بروئے کار لانے کے لیے ہزاروں راستے کھل جاتے ہیں۔ تیسری دنیا کے چھوٹے ممالک میں ایک طریقہ جو نمایاں کامیابی سے آزمایا جا رہا ہے۔ یہ ہے کہ وہاں کی مسلح افواج کو طویل سے طویل تر عرصہ کے لیے سول حکومت کے امور میں الجھائے رکھا جائے۔"

یہ گفتگو اس زمانے میں ہوئی جبکہ روس نے ابھی افغانستان پر قبضہ نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی مشرقی پاکستان میں بنگلہ دیش کی تحریک نے شدت اختیار کی تھی۔ اس کے بعد آج تک ۱۷ میں سے ۱۳ برس ہمارا وطن مارشل لا کے تحت رہا ہے۔ خدا نہ کرے یہ

For more books visit www.4Urdu.com

صورت حال روس اور امریکہ اور اسرائیل کی دلی خواہش پورا کرنے کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام دے۔

سول حکومت کی مشینری کے بارے میں میرا تجربہ اور اندازہ یہ ہے کہ اس کی بہت سی اہم چولیں بتدریج پڑتی جا رہی ہیں۔ اوپر سے نیچے تک خود حفاظتی کی آڑ میں احساس ذمہ داری سے جان بچا کر ٹال مٹول کرنا عام ہو گیا ہے۔ ہر سطح پر قوت فیصلہ کمزور پڑ گئی ہے۔ رشوت کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور اس کا دائرہ عمل بھی افقاً اور عموداً دونوں جانب بہت زیادہ وسیع ہو گیا ہے۔ ان رذائل کا گندہ مواد طرح طرح کے ناسور بن کر معاشرے کے بیشتر شعبوں میں پھوٹ رہا ہے۔

اس کا واحد علاج یہ ہے کہ مارشل لاء خندہ پیشانی ہمیشہ کے لیے اپنے غروب آفتاب کا رخصتی کا بگل بجا کر بیرکوں میں واپس چلا جائے۔ ملک بھر میں بغیر کسی رکاوٹ کے سیاسی عمل از سر نو جاری ہو۔ ہر چوتھے یا پانچویں سال ہر سیاسی جماعت کے اپنے اپنے انتخاب لازمی ہوں۔ تاکہ جماعتی سطح پر قیادت کی چھان پھٹک ہوتی رہے۔ اور ان میں تازہ خون بھی باقاعدگی سے شامل ہوتا رہے۔ اس کے ساتھ اگر اگلے پندرہ برس میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے بھی چار پانچ منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات ہوتے رہے تو ۲۰۰۰ء میں انشاء اللہ ہمارے جمہوری نظام کا بھی ویسا ہی چرچا ہو سکتا ہے جس طرح کہ آج کل ہماری سکوائش' ہاکی اور کرکٹ کا ڈنکہ چار دانگ عالم میں بج رہا ہے۔

علامہ اقبال نے خبردار کیا تھا۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

ہندوستان تو کسی حد تک سمجھ گیا ہے۔ اس لیے سنبھل بھی گیا ہے اور اس کی داستان ہر جگہ بڑی آب و تاب سے جاری و ساری ہے۔ اب اپنے پاکستان میں ہمارے سمجھنے

For more books visit www.4Urdu.com

کی باری ہے۔

قومی سطح پر ہماری سیاسی قیادت کا ایک بڑا حصہ اپنی طبعی یا ہنگامی زندگی گزار کر ہمارے درمیان سے اٹھ چکا ہے' یا جمود کا شکار ہو کر غیر فعال ہو چکا ہے۔ کچھ سیاسی پارٹیوں کے رہنما پیر تسمہ پا کی طرح اپنی اپنی جماعتوں کی گردن پر زبردستی چڑھے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے چند ایک نے کھلم کھلا یا در پردہ مارشل لاء کی آکسیجن سے سانس لے کر سسک سسک کر زندگی گزاری ہے۔ ان نیم جان سیاسی ڈھانچوں میں نہ تو کوئی تعمیری سکت باقی ہے اور نہ ہی ان کو عوام کا پورا اعتماد حاصل ہے۔ پرانی سیاست کی بساط الٹ چکی ہے۔ اب جب کبھی سیاست کا دور دورہ شروع ہو گا تو اس میں فقط ایسی نئی قیادت ابھرے گی جس کا دامن ماضی کی بہت سی آلائشوں سے پاک ہو۔ خدا کرے یا دور جلد سے جلد آئے اور اسے پوری پوری ایمانداری' خلوص اور نیک نیتی سے فروغ دیا جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا یا اس سے رکاوٹیں پڑتی رہیں تو پھر کیا ہو گا؟ اس کے تصور ہی سے دل لرز اٹھتا ہے۔ اس کے بارے میں نوشتہ دیوار جلی حروف میں ہمارے سامنے موجود ہے جسے پڑھنے کے لیے کسی خاص عینک لگانے کی ضرورت نہیں۔

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

کچھ عرصہ سے یہ فیشن بھی عام ہو رہا ہے کہ سول اور فوجی اعلیٰ افسر اپنی اپنی ملازمتیں پوری کرنے کے بعد خاصی تعداد میں بعض سیاسی جماعتوں میں نمایاں مقامات حاصل کر رہے ہیں۔ یہ سیاست اور جماعتوں دونوں کی بد قسمتی ہے۔ سرکاری ملازمتوں کو اپنا اپنا الگ چلن اور رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ اس میں طویل عرصہ گزارنے کے بعد انسان کی سوچ' وضع قطع' اخلاق و آداب' رکھ رکھاؤ' طور طریقہ اور انداز زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ سانچہ ان ضروریات سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو ایک کامیاب

For more books visit www.4Urdu.com

سیاستدان بننے کے لیے لازمی ہیں۔ ایسے سابق اعلیٰ افسر چلے ہوئے کارتوس ہوتے ہیں ان میں سیاسی بارود بھر کر دوبارہ چلانے کی کوشش کرنا عملاً بیکار' بے حاصل اور بے اثر ہے جو سیاسی جماعتیں ایسی بیساکھیوں کا سہارا لے کر زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ عوام میں ان کی مقبولیت کی رفتار بھی بڑی حد تک لولی لنگڑی رہنے کا امکان ہے۔ اسی طرح جو افسران کرام ساری عمر سرکاری ملازمتوں کی کرسیاں گرمانے کے بعد پنشن خوار بن کر سیاست میں کود پڑتے ہیں تا کہ وہ اقتدار کی ان سیڑھیوں پر چڑھ بیٹھیں جن کے ماتحت وہ عمر بھر کام کرتے رہے ہیں۔ تو سیاست کو داغدار کرنے کے علاوہ وہ خود بھی جنت الحمقا میں رہتے ہیں۔ سیاست کا ایک ہمہ وقتی اور محترم پیشہ ہے۔ یہ بہروپیوں کا بازیچہ اطفال ہیں جہاں پر ریٹائرڈ سول اور فوجی افسر اپنے بالوں کو خضاب لگا کر اور پلپلے مسوڑھوں پر نئی بتیسیاں چڑھا کر قوم کو الو بنانے میں کامیاب ہو سکیں۔

اسی طرح غیر مخلص اور سخن ساز نعرے بھی سیاست کے وجود کو کھلکھلا کر دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل چند سیاسی جماعتوں نے مل کر اپنی ایک مخالف جماعت کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ سیاسی اصولوں کے مطابق یہ ایک جائز اور روایتی عمل تھا۔ لیکن جب ان جماعتوں کے گٹھ جوڑ سے "نظام مصطفیٰ" کا نعرہ بلند ہوا تو اس ایجی ٹیشن کا رنگ بدل گیا۔ نظام مصطفیٰ کا نعرہ لگانے والوں پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ یہ مقدس نعرہ منہ سے نکالنے سے پیشتر ان سب کو اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر اپنی ذاتی طرز معاشرت' رہن سہن' حقوق اللہ اور حقوق العباد پر کس حد تک پورا اترتا ہے۔ اس خود احتسابی کے بغیر محض ایک سیاسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایسا محترم نعرہ بلند کرنا اس کی بے حرمتی ہے۔ چنانچہ جونہی مخالف حکومت کا تختہ الٹا' اسی وقت تحریک میں شامل جماعتوں کا اتحاد تار عنکبو کی طرح ٹوٹ گیا۔ اور نظام مصطفیٰ کا نعرہ بھی طاق نسیاں کی زینت بن گیا۔ نظام مصطفیٰ کے حوالے سے اس تحریک کو چلانے کے لیے عوام اور خواص نے دل کھول کر چندہ بھی دیا تھا۔ اس فنڈ کی بد نظمی اور بد انتظامی کے بارے میں کافی عرصہ تک اخبارات میں ایسی خبریں آتی رہیں جنہیں

For more books visit www.4Urdu.com

پڑھ کر ایک عام مسلمان کا سر شرم سے جھک جاتا تھا۔ کسی سیاسی جماعت کے منشور میں دین کو بنیاد بنانا یا سر فہرست رکھنا ایک قابل فہم بات ہے۔ لیکن دین کی آڑ لے کر وقتی طور پر سیاسی مقاصد حاصل کرنا دین کی تضحیک اور بے حرمتی ہے۔ ہماری سیاست کے جو عناصر اس منافقت کے مرتکب ہوتے رہیں گے۔ وہ ہمیشہ منہ کی کھائیں گے اور اقتدار کی ہوس ان کے سینوں میں ہمیشہ ناکامی کی راکھ میں دب کر سلگتی رہے گی۔

سیاست کی اساس یا دین ہوتی ہے یا دنیا' یا دونوں کا حسن امتزاج۔ اگر ہم اپنی سیاست میں دین اور دنیا کے حسین امتزاج کو کسی حد تک نبھانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ ہماری عین خوش نصیبی ہے۔

سیاست کی خود کفالت اس کی پاکیزگی اور توانائی کی کلید ہے۔ جو سیاسی عناصر دوسرے ممالک کی بخشی ہوئی بیساکھیوں کا سہارا لینے پر انحصار کرتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کی آزادی اور نمائندگی کی اہلیت نہیں رکھتے بلکہ الٹا غلامی کا بیج بونے کے مجرم ہیں۔ کچھ عرصہ سے یہ رسم بھی چل نکلی ہے کہ کچھ صاحبان اقتدار اور سیاسی رہنما ایک نہ ایک سپر پاور سے اپنے حق میں سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ضروری تصور کرتے ہیں۔ اگر وفاق میں صوبائی اختیارات نیک نیتی' دیانتداری' خلوص' باہمی افہام و تفہیم اور حقیقت شناسی سے متعین کر کے اس پر سچائی سے عمل درآمد نہ کیا جائے۔ تو فیڈریشن کا وجود کھوکھلا ہو کر کنفیڈریشن کے نعرے میں ڈھل جاتا ہے۔ سیاست ا ور نظم و نسق میں اس زہر کا فوری طور پر حسن تدبر سے کام لے کر تریاق فراہم نہ کیا جائے۔ تو رفتہ رفتہ کنفیڈریشن کا تصور بھی انتشار کے صحرا میں پھیل کر باد سموم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس زہر کا تریاق سیاسی عمل کی آزادی سے ظہور میں آتا ہے فوجی دباؤ کی گھٹن سے نہیں۔

ایٹمی توانائی کا حصول ہر آزاد ملک کا حق ہے۔ اس پر چند مختلف ممالک کی اجارہ داری ایک نئی شہنشاہیت اور سامراجیت کی بالا دستی کے نظام کو جنم دیتی ہے۔ بجلی' ٹیلیفون' ریڈیو' ٹیلیویژن' ہوائی جہاز وغیرہ کی ایجادات فروغ علم کا نتیجہ ہیں۔ علم نہ دبائے دبتا

For more books visit www.4Urdu.com

ہے' نہ چھپائے چھپتا ہے۔ ایٹمی توانائی کا علم بھی دوسرے علوم کی طرح رفتہ رفتہ عام ہو رہا ہے۔ نیو کلیئر ٹیکنالوجی کے حصول اور استعمال کا انحصار وسائل کی دستیابی پر ہے۔ وسائل کی کمیابی سے تاخیر تو ممکن ہے۔ لیکن تدبیر کی کامیابی سے ہمیشہ کے لیے فرار ناممکن ہے۔ پاکستان میں ایٹمی سائنس کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا ہماری ہر حکومت کا فرض ہے۔ اس میں معذرت خواہی سے کام لینا ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ روس' امریکہ' اسرائیل اور بھارت ہمارے ایٹمی مراکز کو تباہ کرنے میں یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن ہمارا اصلی دفاع یہی ہے کہ ہم نیوکلیئر اسلحہ جات سے پوری طرح لیس ہوں۔ "اسلامی بم" کے طعنوں اور دھمکیوں میں آ کر گھٹنے ٹیک دینا ایک مجرمانہ لغزش ہو گی۔ جو ممالک "اسلامی بم" پر قدغن لگانے میں پیش پیش ہیں۔ ان سے بعید نہیں کہ وہ کسی وقت اسلامی اعمال کو بھی ممنوع قرار دینے کا نادر شاہی حکم صادر فرما دیں۔ ایسے عناصر کو پائے حقارت سے ٹھکرانے میں ہی ہماری خود اعتمادی اور عزت نفس کی بقا ہے۔

دنیا بھر میں جنگ کی بنیاد انفرادی یا محدود قبائلی سطح پر زر' زن اور زمین کی حرص میں شروع ہوئی تھی۔ پھر اس نے سامراجیت (Colonialism) کا رنگ چڑھا کر زبردست کی حکمرانی کی اور زیردست کی غلامی کا وطیرہ اختیار کر لیا۔ اس کا بنیادی مقصد ملک گیری کی ہوس تھا۔ اگلی منزل میں سیاسی نظام' معاشی نظریات اور سماجی اقدار میں اختلافات اور تصادم نے بڑے پیمانے پر عالمگیر جنگوں کا سلسلہ شروع کیا۔ اب رفتہ رفتہ ہوا کا رخ مزید بدل رہا ہے۔ حالیہ آثار گواہی دیتے ہیں کہ جلد یا بدیر سب سے بڑی اور ممکن ہے کہ آخری جنگ دین کی اساس پر دو تہذیبوں اور تمدنوں کے درمیان لڑی جائے۔ دنیائے اسلام ایک طرف اور باقی تمام غیر مسلم عناصر باہم مل جل کر دوسری جانب اس امکان کو فراموش کریں یا اس سے نبرد آزما ہونے کی تیاری میں غفلت سے کام لینے میں عالم اسلام کو عموماً اور پاکستان کو خصوصاً سب سے بڑا اور مہلک خطرہ ہے۔

اسرائیل کے خلاف ہماری پالیسی عربوں کو خیر سگالی حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ بلکہ

For more books visit www.4Urdu.com

اسلام اور فقط اسلام کے ناطے سے ہے۔ یہود اور نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے اس پالیسی میں کسی قسم کی لچک یا کمزوری کو جگہ دینا لاریب اسلام کے ساتھ غداری کے مترادف ہے۔ ایسی حرکت بے برکتی کی آندھیوں کو دعوت دے کر وطن عزیز کے وجود کو طرح طرح کے خطرات میں مبتلا کر سکتی ہے۔ یہ محض سیاسی حماقت ہی نہیں بلکہ دینی جرم بھی ہے۔

URDU4U.COM

اسی طرح بھارت کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے (Normalization of Relations) کی آڑ میں ریڈ کلف لائن کو مدھم ہونے سے بچانا ہر صورت میں لازمی ہے۔ "بغل میں چھری اور منہ میں رام رام" والا محاورہ ایک ابدی اور اٹل حقیقت ہے۔ بھارت کے عزائم اور اعلانات میں ان کے ظاہر اور باطن کی تمیز کو چشم بصیرت' حسن تدبر اور شیوۂ دیوانگی سے پرکھنا ہمارا اولین فرض ہے۔ اگر یہ تمیز مصلحتوں یا غفلتوں کی نذر ہو گئی تو بربادی' تباہی اور فنا کا اندھا کنواں منہ پھاڑے سامنے کھدا پڑا ہے۔

افغانستان پر روس کا تسلط اسلام پر کھلا حملہ ہے۔ مشرق اور مغرب کے نام نہاد سیکولر اور آزادی پرست اقوام کے دل میں اسلام کے خلاف ہمدردی نہیں بلکہ بغض اور کینہ ہے۔ زبانی کلامی اعلانات اور ایک سپر پاور کے خلاف محدود مالی یا اسلحہ جاتی امداد محض نمائشی ڈھونگ ہے۔ اس بھرم کو قائم رکھنے کے لیے بہت سے ملک ہمارے ساتھ ہیں لیکن یہ قضیہ ہمیں کو چکانا ہے۔ رفتہ رفتہ روس کی افواج کسی نہ کسی حد تک واپس چلی جائیں تو چلی جائیں لیکن روسی اثرات کے جراثیم آسانی سے جانے والے نہیں ہیں۔ وقت کے ساتھ یہ جراثیم جڑ پکڑتے رہیں گے۔ اگر سنٹرل ایشیا کے پسے ہوئے خوابیدہ مسلمان بیدار نہ ہوئے' تو ممکن ہے کہ افغانستان بھی انہی کا ہمرنگ ہو جائے۔ پاکستان میں اسلام کے فروغ کا نصب العین فقط ہمارے مفاد ہی میں نہیں' بلکہ افغانستان اور سنٹرل ایشیا کے لیے بھی کام آ سکتا ہے لیکن Islamization کے پردے میں Cosmetic Islam کا ڈھونگ رچانا منافقت کی دھول اڑانے کے علاوہ کوئی مقصد پورا نہیں کر سکتا۔ ہمیں

For more books visit www.4Urdu.com

اسلام کے بنیادی اور حقیقی اصل اصول Funamentalism کو اپنانے کی ضرورت ہے۔
اس کے بغیر امور ریاست میں اسلام کے نام پر سب کچھ بیکار بے بنیاد ہے۔
URDU4U.COM
ہمیں حب الوطنی کا جذبہ نہیں بلکہ جنون درکار ہے۔ جذبہ تو محض ایک حنوط شدہ لاش کی مانند دل کے تابوت میں منجمد رہ سکتا ہے۔ جنون جوش جہاد اور شوق شہادت سے خون گرماتا ہے۔ اسی میں پاکستان کی سلامتی اور مستقبل کا راز پوشیدہ ہے۔

عطا اسلاف کا جذب دروں کر
شریک زمرہ لا یحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکائیں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر